میرا کوئی ماضی نہیں
سحاب قزلباش

سحاب قزلباش نے اپنی یادوں کی کتاب کا بڑا معنی خیز نام رکھا ہے۔ اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ کہنا کہ "میرا کوئی ماضی نہیں ہے"۔ دراصل حیرت اور استعجاب کا اظہار ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنی کسی پرانی تصویر کو دیکھ کر یہ کہے کہ: "یہ میں نہیں ہوں"۔ اس جملے کو حرف نفی نے مثبت جملہ بنا دیا ہے۔ اس کے بین السطور معنی یہ ہیں کہ کبھی میں ایسا ہی تھا۔ اسی طرح سحاب کی کتاب کے نام میں بھی بقول غالب اثبات، نفی سے تراوش کرتا ہے اور بین السطور معنی یہ ہیں کہ ماضی تھا اور بہت شاندار! لیکن سحاب جیسے حساس لوگوں کے ہاں زمانہ ماضی و حال و مستقبل میں تقسیم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک ایسی مسلسل کیفیت کا نام ہے جس میں گزرے ہوئے اور آنے والے لمحے لمحۂ موجود ہی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

کتاب کے نام کی ایک توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرا کوئی ماضی اس لئے نہیں ہے کہ اب یہ میرے لمحۂ موجود کا حصہ بن چکا ہے۔

بظاہر تو اس کتاب میں بعض شخصیات کے حوالے سے مضامین یکجا کئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سحاب نے اپنے گزرے ہوئے لمحوں کو از سر نو گزارنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں وہی لمحے مقید کئے گئے ہیں جو سحاب کو شخصیات کے جھروکوں سے نظر آئے ہیں۔ ان لمحوں کی آغوش میں ہمیں اپنے ادب کی بڑی بڑی شخصیات دکھائی دیتی ہیں اور اسی طرح زندہ نظر آتی ہیں جیسے وہ کبھی تھیں۔

سحاب نے جس کو جیسا پایا ویسا ہی کتاب کے اوراق پر پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب نہیں آئینہ ہے۔ سحاب خود بھی اس آئینے کے سامنے کھڑی ہیں۔ وہ جیسی ہیں ویسی ہی اس میں نظر آ رہی ہیں۔

مشفق خواجہ

میرا کوئی ماضی نہیں

سحاب قزلباش

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار۔ کراچی

اِنتساب

اپنے والد محترم آغا شاعر (مرحوم)

والدۂ محترمہ نور جہاں آغا شاعر (مرحومہ)

اور اپنے بڑے بھائی آغا آفتاب کے نام

گفتارِ صدق مایۂ آزار میشود

آوازِ حق بلند شود دار میشود

(صائب)

فہرست مضامین

انتساب ۳

تعارف مشتاق احمد یوسفی ۵

دیباچہ ۷

جوش چا ۹

میراجی ۱۵

ن۔م۔راشد ۲۵

فیض صاحب ۴۷

کلرڈ پیشنٹ انشا ۷۴

تراشیدم پرستم شکستم (بخاری صاحب) ۹۱

محمود نظامی ۱۱۳

میری عصمت آپا ۱۱۹

خدیجہ مستور ۱۳۱

جمیلہ ہاشمی ۱۳۸

نخشب جارچوی ۱۴۵

کتاب والا ۱۶۲

سحاب قزلباش

تعارف

"میرا کوئی ماضی نہیں۔" یہ نہ سحاب قزلباش کا "بیان صفائی" ہے 'نہ وضاحتی نوٹ۔ یہ عنوان اس لحاظ سے بھی موزوں ہے کہ ماضی بعید کی جن شخصیتوں کی یادوں اور باتوں۔۔ اور شاذ و نادر کسی کی گھاتوں۔ پر یہ مشتمل ہے' ان کو مصنفہ نے نہ صرف اپنا حال بنالیا ہے بلکہ قرائن سے یہی لگتا ہے کہ یہی ان کا مستقبل بھی ہو گا' کیوں کہ وہ اس میں قلم قلم ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ ان کے خلوص اور سادہ کاری کا کمال ہے کہ اس حال میں انہوں نے پڑھنے والوں کو بھی بحصہ مساوی شریک کر لیا ہے۔ ان یادوں اور خاکوں میں جابجا پہلی ملاقات کی تازگی اور تحیر کے ساتھ دیرینہ رہ و رسم شناسائی کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

"نخشب"' "میراجی" اور "ادھر تقاضی" (فیض) یاد رہنے اور یاد رکھنے والے ہیں کہ ان میں بعض ایسے دلاویز پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جو عام قاریوں' (جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے) کی نظروں سے اوجھل تھے۔ بعض اوقات وہ بظاہر معمولی اور روزمرہ کی جزئیات سے اپنا اصل مدعا بیان کر دیتی ہیں۔ نخشب نے کبھی انہیں شادی کا پیام دیا تھا۔ اب نخشب کی میت ان کے سامنے برف کی سلوں پر رکھی ہے۔ اور ایک طویل۔ گاہے جذباتی' گاہے سفاک۔ فلیش بیک میں وہ سب کچھ اس طرح بتا دیتی ہیں کہ کوئی لائن پوری نہیں کھینچتیں۔ کبھی بیچ میں' اور کبھی اس سے پہلے ہی' برش روک کر اسے اپنے آنسوؤں میں ڈبو لیتی ہیں۔ وہ خود کہتی ہیں: "مجھے اس زمانے میں بھاگنے کی عادت تھی۔ میں نے کسی کو ٹھہر کر نہیں دیکھا۔ جو راہ میں نظر پڑا' دیکھتی گزر گئی۔ نہ جانے طبیعت میں ایسی تیزی تھی کہ جیسے راہ رو بچھڑ جائیں گے۔ میں تنہا رہ جاؤں گی۔ چلنے والوں کے قدموں کے نشان پر چلتی گئی۔ کسی بھی چہرے کو غور سے نہ دیکھا۔" لیکن اس مشاہدہ رواں میں جو کچھ انہوں نے دیکھا اور دکھایا ہے وہ یقیناً حاصل مطالعہ ہے۔ مثلاً وہ اس لمحے کو منجمد کر لیتی ہیں جب نخشب مرحوم کی چہیتی انوری بائی نے "موتیا کے پھولوں کی بالیاں پہنے' ہیرے کی کیل ناک

میں پہنے، تانپورے پہ سر رکھے، آنکھیں بند کئے ابھی ابھی یہ غزل ختم کی ہو۔ جیسے وہ آج میرے پاس تمہارے پرے کو آئی ہو... اور میں نے سارے ضبط توڑ دیئے۔ چوڑیوں کے شیشوں کے ننھے ننھے ٹکڑے آنکھوں سے چھنا چھن گرنے لگے۔"

چند ورق الٹیں تو ایک اور تصویر نظر آتی ہے۔ وہی میراجی جو لفافہ سا سینہ تان کر اپنے ہونٹ بھینچ لیا کرتے تھے، اب مرنے کے بعد بھی "کٹوراسی آنکھیں گھورتی ہوئی، جیسے تم نے پہلے دن سے گھورنا شروع کیا تھا اور ابھی تک اسی طرح گھور رہے ہو۔ لمبے لمبے بال۔ گھنی مونچھوں اور داڑھی میں پھیلی ہوئی نگاہیں، پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ پتلیاں تک ٹھہر گئی تھیں۔" جے جے ونتی سن کر یہی آنکھیں ساری رات آنسو بہاتی ہیں۔ پھر انہی آنکھوں کو سحاب اپنے مجلہ دل کا ایک اور منظر دکھاتی ہیں۔ "سارے چہرے پر صرف آنکھیں ایسی تھیں جو وہی پرانی دیکھی دیکھی سی... میں آج تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ چار سال سے اسی کمرے میں، جس میں تمہارا فوٹو ٹانگ رکھا ہے۔ مجھے اب تم پر خاصا رحم آتا ہے۔ تم نے کیا کیا نہ دیکھا اس کمرے میں۔"

اور ہم کیا کیا نہیں دیکھتے اس کتاب میں۔ فیض، جوش، ن۔ م۔ راشد، ابن انشاء اور خدیجہ مستور سے وابستہ یادوں میں پڑھنے والوں کو بھ وہی لطف محبت۔ اور کبھی کبھی کرب قربت بھی۔ محسوس ہو گا جس نے ماضی اور حال کی حد فاصل کو کچھ اس طرح محو کیا ہے کہ بقول میر

عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

سحاب قزلباش نے ان شخصیتوں کو بہت قریب سے، اور تادیر دیکھا ہے۔ اور جو جھلکیاں ہمیں دکھائی ہیں وہ نہ صرف دل کو لبھاتی ہیں، بلکہ ہماری معلومات میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی زبان اتنی سلیس اور اسلوب اس قدر سادہ اور پراثر ہے کہ جہاں کہیں ان کی آنکھیں وفور جذبات سے پرنم ہو جاتی ہیں، وہاں بھی تحریر کی روانی اور دل نشینی میں فرق نہیں آتا۔

مشتاق احمد یوسفی

دیباچہ

میں نے ان سب کو کس طرح دیکھا یا مجھے یہ کیسے نظر آئے؟ ہو سکتا ہے کچھ رخ ایسے ہوں جو مجھے نظر نہیں آئے۔ یا ان کی اپنی شخصیت نے مجھ سے چھپا لیے ہوں، میرے ملنے پر انہوں نے احتیاط کے پردوں میں بھیج دیا ہو اپنی شخصیت کو۔ اور وہ رخ جو آپ نے دیکھا مجھے کبھی نظر نہ آیا ہو۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، ان کے اپنے گھروں میں کئی کئی گھنٹوں میں مجھے جو بھی میسر آیا، وہ پڑھ لیا۔ ویسے وہ بھی ایک طرح کی بے ایمانی ہے۔ جو تم کو چاہیں تم ان کی حرکات و سکنات چراتے رہو۔ کچھ شخصیتوں کو تو میں نے بہت چاہا ہے۔ کچھ میری تنہائی کے ہمراہی رہے۔ کچھ مجھے ہنسنا سکھا گئے۔ کچھ نے مجھے جینا سکھایا، چلنا پھرنا، اپنے راستوں پہ قدم جمانا سکھایا۔ کچھ کو دیکھ کر مجھے پچھتاووں کا سنگھار بھی کرنا پڑا۔ کچھ میرے خواب بھی چھین کر لے گئے۔ کچھ کی آوازوں سے میرا لڑکپن، میری جوانی گنگنا اٹھتے ہیں۔ کچھ آوازوں کو میں اپنی باقی زندگی بھی بخش چکی ہوں۔ یہ سب پڑھنے کے بعد اگر آپ کو ان کی شخصیت سے اختلاف ہو تو خفا نہ ہوں، الزام نہ دیں۔ مجھ کو تو ایسے ہی نظر آئے۔ یا میرے دل نے ایسا ہی چاہا ہو۔ مجھ میں سب سے بڑی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ جس کو اس بڑھاپے میں بھی نہیں سدھار سکی۔ ابھی تک دل کا کہنا مانتی چلی آئی ہوں یہ کمبخت ایسا خود سر ہے، اس کی توانائی میں کہیں بھی بڑھاپا نہیں آیا۔

دعا کیجئے یہ بھی میرے موٹاپے اور بڑھاپے کی طرح تھک جائے تو اچھا ہے۔ لوگ اس عمر میں ایک کونے میں بیٹھ کر پچھلے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے اپنے عقیدوں کے ترازوؤں میں اچھائیوں برائیوں کے تجربوں کو عبادت سے پاک کرتے رہتے ہیں۔ یہ کمبخت ادھر بھی نہیں آتا۔ نہ جانے یہ نارمل حالت پہ کب آئے گا۔ دوسرے ملکوں میں تو ساٹھ سال میں سنیئر سٹیزن بنا دیتے ہیں۔

جوش صاحب

جوش چاچا

صبح کے اخباروں میں ادیبوں نے آپ کے انتقال پر ملال پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار کیا۔ تعزیتی پیغامات شائع ہو رہے ہیں' ادیبوں کی فہرست میں منتخب نام جگمگا رہے ہیں۔ اخبارات کی سرخیاں آپ کے نام سے جھلملا رہی ہیں۔ کل رات کے مین بلیٹن آپ کی خبر سے شروع ہوئے۔ اب ادبی صحبتوں کا ذکر ٹی وی' ریڈیو میں آپ کے نام سے کیا گیا۔ گویا سارے ملک کی محبت صرف آپ کی موت کا انتظار کر رہی تھی اور اب پھٹی پڑتی ہے۔

اس سے پہلے ملک کے سارے ادیب منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے اور تو اور ابھی پچھلے مہینے ہی تو اتنی بڑی اہل قلم کانفرنس بالکل آپ کے پڑوس ہی میں ہوئی تھی جس میں پانچ سو کے قریب ادیب شریک ہوئے تھے۔ اسلام آباد کے بڑے ہوٹلوں میں مقیم رہے۔ دعوتیں اڑاتے رہے۔ مقالے پڑھتے رہے۔ ملکی سربراہ بھی ادیبوں سے خوش تھے اور سچ مچ تین دن کی مہمان داری سے تو مجھ جیسے بھی نمک خوار بن گئے اور دعوت شیراز سے پشتوں کی سیرابی ہو گئی۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ آپ کتنے قریب ہیں اور ہاں آپ کی زیارت کے لئے تو صرف مجتبیٰ' سحر انصاری' ممتاز حسین اور میں ہی پہنچے تھے۔ یہ شعراء اور ادیب جو آج یہاں موجود ہیں انہیں ذرا بھی خیال نہ آیا کہ آپ کے بارے میں کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ آپ کس حال میں ہیں جبکہ آپ کے اس مقولے سے سب ہی واقف ہیں

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہئے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہئے
کہتا ہے کون؟ پھول سے رغبت نہ چاہئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہئے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

اردو کا عظیم شاعر، شاعر انقلاب شبیر حسن خان جوش اس کانفرنس ہال سے قریب ہی ایک بڑے گھر میں قید تنہائی میں سسک رہا ہے۔ تنہائی اسے ڈس رہی ہے۔ اس کی تازگی اور شگفتگی کو تنہائی کے گھن نے چاٹ لیا ہے چنانچہ کس کرب سے اس کا اظہار کیا گیا ہے

کس کو آتی ہے مسیحائی کسے آواز دوں
بول! اے خوں خوار تنہائی کسے آواز دوں

وہ باغ و بہار ہستی خاموش پلنگ پر لیٹی گزرتے دن دیکھتی رہتی ہے۔ کمرے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے جو ایک ایک پل زندگی گزارتے اب تھک گیا ہے۔ شناسا چہروں نے کیا دے دیا، سب ہی منہ موڑ گئے۔ آنکھوں کی پہچان بھی چہرے سے غائب ہو جاتی ہے۔ دھندلی آنکھوں میں پہچان چمک کی صورت میں گھنٹوں میں واپس آتی ہے۔

اے میرے شاعر انقلاب، قابل قدر شاعر! وہ علم و حکمت کا خزانہ جو آپ نے اردو کو بخشا ہے کئی سال سے اس پر تالے لگا دیئے گئے ہیں یا اب بہت سا ڈرائنگ روموں کی الماریوں کی زینت بن گیا ہے لیکن ریڈیو اور ٹی وی پر نشر نہ ہو سکا۔

کچھ ہی دن پہلے اخباروں میں خبروں کے خوبصورت لیبل لگنے شروع ہو گئے تھے۔ پیٹ میں السر ہے۔ حالت خراب ہے۔ اسپتال میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ سینے کلیجے کے زخم مہذب شہری، سفید پوش شرفا کیسے چھپا لیتے ہیں۔ ایسے ہی سہے جاتے ہیں۔ یہ آپ کے خاندان نے آپ کو سکھایا تھا اور آپ چہرے پر سوچ بکھیرتے رہے سوچتے رہے اور اس کی کیسی کیسی سزائیں بھگتتے رہے، جواب جاہلاں باشد خموشی، کا وتیرہ اختیار کیے رہے۔ آپ بہت عظیم تھے جوش چچا اور اب ہمیشہ

عظیم تر رہیں گے۔

اب جب کہ ذمہ دار ہاتھوں نے اسلامی طریقے سے آپ کو دفنا کر آپ کی عاقبت سنوار دی ہے اور اسلامی دنیا نے آپ کی مغفرت کی دعائیں کی ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ آپ کو معاف کر کے نماز جنازہ بھی پڑھا دی گئی اور اب ان کی آنکھوں میں نرمی اور آنسو بھی ہیں، شاید ان نیک روحوں کی وجہ سے رب العزت بھی آپ کو معاف کر دے۔

اب آپ کی یاد میں جلسے ہوں گے مقالے پڑھے جائیں گے ملک ملک میں آپ کے قصیدے پڑھے جائیں گے، آپ کی شخصیت، آپ کے فن اور آپ کی تخلیقات پر سارا ملک خراج تحسین پیش کرے گا۔ پھر سے آپ سب کو بے اختیار پیارے لگنے لگے ہیں، پچھتاوے کا یہ مہذب لباس کیسی جلدی بدل گیا۔ آپ کے دل کے ٹکڑے سعیدہ باجی اور سجاد بھائی دونوں اولادیں جن کی عافیت کے لئے آپ نے تن من کی بازی لگا دی تھی آخر شاعر باپ بھی تو تھا!

آپ کی نسل کے سپہ سالار کیسے تڑپ تڑپ کر رو رہے ہیں۔ وہ جن سے آپ کی نسل چلے گی۔ آپ کا وہ وفا شعار کتا راتوں کو آپ کی بے چینی کی خبر کس طرح بچوں سے کھرچ کھرچ کر دیا کرتا تھا جس سے دونوں بچوں کو معلوم ہو جاتا کہ آپ کو پانی چاہئے، دوا چاہئے یا کوئی اور ضرورت ہے۔ وہ کتا آپ کے کمرے سے بچوں کے کمرے تک رات بھر قاصد کے فرائض انجام دیتا تھا مگر دن کو سورج نکلتے ہی تھک کر سو جاتا۔ آپ کے کمرے کے باہر برآمدے میں اس صبح بھی سویا ہوا تھا جب گیارہ بجے اسلام آباد میں اہل قلم کانفرنس کے آخری دن مجتبیٰ بھائی، ممتاز حسین، سحر انصاری اور میں آپ کے گھر پہنچے تھے۔ اس بڑے گھر کے باہر ڈھائی گرہ لمبے بورڈ پر صرف جوش ملیح آبادی لکھا ہوا تھا۔

مجتبیٰ بھائی نے بتایا تھا کہ وہ پہلے بھی صبح کو دو دفعہ آئے مگر بچی نے ادھر ہی سے کہہ دیا تھا کہ جوش صاحب سو رہے ہیں اور اب واقعی مجھے بھی یہی بتایا گیا تھا۔ آج کل آپ سجاد بھائی کے قبضے میں تھے بلکہ ان کے بچوں کی سپرویژن میں۔ بچی نے کہا وہ تو سو رہے ہیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہم جگا نہیں سکتے۔ میں حیران رہ گئی جوش صاحب لاکھ بیمار ہوں مگر دن کو اور گیارہ بجے تک نہیں سو سکتے۔ میرے نام بتانے پر بچی کچھ جھجکی اور کہا آجایئے اور ہم سب خوش ہو گئے جوش صاحب کو دیکھیں گے۔

آپ کی اس آخری ملاقات کا منظر! دن رات کھٹا کھٹ وہی ایک فلم اتار تا رہا اور موتیا کے

مرجھائے پھولوں نے آپ کے چہرے کی سرخی چھپالی تھی۔ صبح صبح روشن آنکھیں جن میں ستاروں نے چمک بھردی تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراتی تھیں نہ صرف مسکراتی تھیں بلکہ قدرت کی صناعی پر حیران بھی ہوتی تھیں۔ سفید اجلے براق کلف لگے کرتے میں گلابی تازہ شگوفے جیسا چہرہ ہر صبح میں اپنے کمرے میں جاکر دیکھا کرتی تھی۔

۱۹۵۰ء میں جب آپ کراچی میں میرے گھر آکر ٹھہرے تھے تو آپ کے کمرے میں مجھے صرف صبح کو آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ شام کے ٦ بجے کے بعد مجھے اس کمرے میں جانے کا حکم نہ تھا۔ میرے سامنے کانچ کا گلاس رکھتے ہوئے کیسے محتاط ہو جاتے تھے اور آپ یہ کبھی نہیں بھولتے تھے۔ حیدر آباد دکن کے مشاعرے میں جب میں آپ کے ساتھ گئی تھی اس وقت بھی آپ نے یہی احتیاط برتی تھی۔ آپ جس ہوٹل میں مقیم تھے وہاں شعراء سے کمرہ بھرا ہوتا تھا لیکن اس نشست میں شام کو مجھے اجازت نہ ہوتی تھی۔ ہاں البتہ مشاعرے میں ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔

کانچ کے گلاسوں کے آپ ہمیشہ ہی دشمن رہے۔ پہلی دفعہ جب آپ دلی ہمارے ہاں آئے تھے تو آپ کے قہقہوں سے برابر کے کمرے میں جہاں میں سوئی ہوئی تھی میری آنکھ کھل گئی۔ آپ قہقہے لگا رہے تھے اور بابا آپ کو رخصت کرتے وقت کہہ رہے تھے 'تم ملعون میرے سارے گلاس تلف کردیتے ہو.... ایک چھناکے سے وہ گلاس ہری بیل لگے برآمدے سے باہر نیچے پھینک رہے تھے اور میں سوچتی کہ اب جب جوش چچا آئیں گے تو میں بابا کے ہاتھ سے گلاس لے کر خود برآمدے سے باہر پھینکوں گی۔ آپ اکثر راتوں کو آتے' باتیں ہوتیں 'شاعری ہوتی ورپھر آپ بابا کے پیار بھرے جملوں سے قہقہے بلند کرتے ہوئے چلے جاتے' مگر یہ وہ زمانہ تھا جب کسی کی گور تک کوئی نہیں پہنچتا تھا خداؤں کے لئے کوئی تعین نہیں تھا۔ پیتل کے مٹی کے جیسے خدا چاہتے بنالیتے اور پوجتے۔ اپنی اپنی گور اپنا اپنا غم۔ مذہب کا فرق تو ایک گائے کٹنے پر انسانوں کے کاٹے جانے کی اخباری خبروں سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ ان دونوں فرقوں کے درمیان ایک گائے تھی۔

جوش چچا بے حد وضع دار تھے۔ بابا کی وفات کے بعد بھی ہمارے ہاں برابر آتے اور اکثر اس شان سے کہ مشاعروں سے واپسی پر شاعروں کی ایک کھیپ ساتھ ہوتی۔

جوش' مجاز' جگر' ساغر نظامی' شکیل' نخشب' صابر' وامق' سب ہی باہر سے آئے ہوئے شاعر مردانے میں آجاتے اور صبح ٦ بجے سے نہاری بگھاری جاتی۔ فرش پر لمبے سے دسترخوان پر سب

بستروں سے اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ مگر جوش صاحب صبح صبح غسل کر کے، مسرور شگفتہ چہرہ لئے سفید براق کپڑے پہنے سب کے ساتھ شریک ہوتے، وہ اس وقت یوں تر و تازہ دکھائی دیتے جیسے شب بیداری نے ان کے چہرے کی تازگی کو چھوا تک نہ ہو اس کے برعکس جگر صاحب سنگھار کرنے کے بعد بھی برسوں کی نیند سے بوجھل چہرہ رکھتے تھے۔ مجاز کو کس پیار سے جوش صاحب چونکاتے جو بے جان مردہ انگلیوں سے آنکھیں بند کئے غنچہ سے دہن میں چھوٹے چھوٹے نہاری کے لقمے اتارتے چلے جاتے۔

یہ شاعر انقلاب ہی تھے جنھوں نے میرے بھائیوں کو تاکید کر کے مجھے ریڈیو جانے کے لئے اجازت دلوائی جو آج تک میری معاش کا تنہا ذریعہ بن کے رہ گیا۔ اس آخری ملاقات کے لئے ہم سب ان کے پاس جا بیٹھے۔ مجتبیٰ بھائی نے ان کے کان کے قریب چیختے ہوئے کہا "اجی جوش صاحب، جی میں نے جلدی جانا ہے" تو انہوں نے حیرت سے مجتبیٰ بھائی کو غور سے دیکھا پھر سرک کر دیر تک انہیں گلے سے لگائے رہے۔ میری طرف دیکھا تھا، میرے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے ہاتھ سے لکھا "آفتاب تو میرا بیٹا ہے، اسے بھیج دو" میں نے وعدہ کیا لیکن جیسے انہیں معلوم تھا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کہا۔ تم.... نہیں.... بھیجو گی۔ اور آج میں بیٹھی سوچ رہی ہوں۔ افسوس کتنی جھوٹی ہوں میں ---

اب ایک کمرے میں آفتاب بھائی صاحب بیٹھے رو رہے ہیں کہ اب پنڈی کس کے پاس جائیں گے۔ پنڈی جانا بھی آسان نہیں تھا۔ دو تین ہزار ہوتے تو آپ سفر پر جاتے۔ جوش چچا! آفتاب بھائی کے کوئی دوست مہربان آغا حسن عابدی کی طرح بھی نہیں جو اب تک اس پر قائم ہیں کہ سیدھے ہاتھ سے دو تو الٹے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

آغا صاحب ہم سب سے بازی لے گئے۔ وہ آپ کو واقعی چاہتے تھے جو ہر مہینے آپ کو یاد رکھتے تھے -- ہم تو آپ کے کسی کام نہ آسکے

کس کو آتی ہے مسیحائی کے آواز دوں
بول اے خونخوار تنہائی کے آواز دوں
پڑھتے پڑھتے دکھ گئی ہیں پتلیاں
بجھ رہی ہے شمع بینائی کے آواز دوں

چل رہے ہیں دل پہ اب تک چاندنی کے نشتر
چبھ رہی ہے دل میں پروائی کے آواز دوں

پر میں تو بالکل اداس نہیں۔ مجھے سب معلوم تھا۔ ایسے ہی ہو گا۔ مرنے کے بعد میرے ملک کے لوگ ایسے معصوم ہیں۔ سب کو معاف کر دیتے ہیں۔ اور پھر دیوانہ وار چاہنے لگتے ہیں۔ قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ دیے جلاتے ہیں۔

میراجی

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اے کاش تم ایک دفعہ تو مجھ سے خفا ہوتے۔ مگر تم تو تھے ۔۔۔ بس کیا کہوں۔
اگر تم زندہ ہوتے تو کبھی ایک لائن بھی نہ لکھتی تم پر ۔۔۔ بیکار میں نہ جانے تم اپنی الٹی کھوپڑی میں کیا سمجھ بیٹھتے اور یہ جو تمہاری تصویر اس وقت میرے سامنے رکھی ہے، لو تم پھر مسکرائے۔ یہ تو میری عادت ہے تصویریں جمع کرنے کی۔ اتنے ڈھیر سے دنوں کے بعد سر سے اس کتاب میں سے اچھل کر گر پڑی یہ تصویر۔ بالکل اس طرح۔
جیسے ہم سب سر سر کرتے ایک دفعہ ہی اس موٹی سی کتاب میں سے پھسل پڑے۔ اب کتاب تو بند ہو چکی ہے۔ اور ہم سب اس کے باہر پاکستان میں آنکھ کھولے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ہل بھی نہیں سکتے۔ سنا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا میں اس قدر غنودگی ہے اور یہ اتنا زنگ لئے ہوئے ہے کہ ہم بھی لوہے کے ٹکڑے بن بن کر آخر کار زنگ آلود ہو ہی گئے۔ سوچتے سوچتے پھر نیند آ جاتی ہے۔ اتنی ہمت نہیں کہ اٹھ سکیں، چل پھر سکیں۔ آندھیوں کے انتظار میں لوہے کے ٹکڑے حلقوں کی شکل میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔۔ نہ جانے کتنی لمبی زنجیر ہے جس کی لمبائی ختم بھی ہو گی یا ۔۔۔ سوچو تو بھی لاکھ آندھیاں چلیں کون ان کے ٹکڑے کرتا پھرے گا۔ کون ان کا زنگ اتار کر چمکاتا پھرے گا۔ اور ہماری یہ حالت ۔۔ سر اٹھا کر کتاب کی اس اونچائی کو دیکھا اور گر پڑے۔ ہمت

ہی ذرا جذباتی ہوئے تو دو ایک نظمیں زنجیر کے آخری حصے تک پہنچا دیں۔ کسی نے کچھ قصیدے کہہ ڈالے۔ افسانوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ ایک جیسی کہانیاں۔ مرطوب ہوائیں لیئے لیئے جب کبھی لے دیکے چاند نظر آیا تو تھوڑا سا رومینٹک ہو لئے۔ اردگرد کے حلقوں میں بھی تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ اور پھر سو گئے۔ اس نیند کی بے خودی نہ پوچھو۔ ٹھنڈے میٹھے سہانے سپنے۔ ریشمی جھولے۔ پھلوں سے بھری قابیں۔ معطر ہوائیں اور خوشبو میں بسے نزدیک نزدیک جسم۔۔ کتنا قرب۔۔ ہاں یاد آیا۔۔ اور تم اس وقت میرے کتنے قریب ہو۔۔ میں آج تمہیں کتنے غور سے دیکھ سکتی ہوں۔ اس وقت میں کتنی تنہا ہوں۔ زندگی بھر ترستے رہے کہ میں تم سے ڈھنگ سے بات ہی کر لیتی۔ مگر تم جانتے ہو کہ مرنے کے بعد بڑے بڑے فائدے ہیں۔ جنت و دوزخ کا ذکر اس وقت میں کرنا نہیں چاہتی۔ وہ تو اگر ہمیں تمہیں کبھی تنہائی نصیب ہوئی تو وہاں کے حالات تم خود ہی اگل پڑو گے۔ سنو تم مطمئن تو اب بھی نظر نہیں آتے۔ اسی طرح مضطرب ہو۔ اس دنیا سے وہ دنیا ہی اچھی ہے کیا؟۔۔ آرام سے سوتے تو رہتے ہو گے؟ کیا ان راہوں میں بھی جگہ جگہ کھڑی میرائیں تمہیں ٹھوکروں سے جگا پاتی ہیں، یقین تو نہیں آتا۔ خیر چھوڑو۔ ہمیں بھی کوئی نہیں پوچھتا آج کل۔۔ مرنے کے بعد اس قدر لطف ملتی ہے۔ توبہ ابھی کئی مہینوں سے تم پر اس قدر لوگوں کو پیار آرہا ہے کہ میں تو پڑھتے پڑھتے سخت جل گئی۔۔ تمہاری مسکراہٹ میں اب بھی طنز ہے۔

تم زندگی بھر عورت کے قرب کے لئے ترستے رہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ جو اوٹ پٹانگ نظمیں کہہ ڈالیں اس کے جسم پر۔۔۔ ذہنی بھوکے۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم بہت ذہین تھے۔ بہت اونچے شاعر تھے۔۔ ہو گے۔۔ سچی بات تو یہ ہے اپن کے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔ جو ستارے سے اندھیرے دماغ میں زبیدہ آغا کی پینٹنگ دیکھ کر چکتے ہیں وہی تمہاری نظمیں پڑھ پڑھ کر چکے ہوں گے یاد نہیں اس وقت کی حالت۔ یہ ظاہر اس چیز سے ہوتا ہے کہ کوئی بھی تمہاری نظم کا عنوان۔ اس کا جسم۔۔ شکل کچھ بھی تو یاد نہیں۔ ایک دفعہ تم نے میری ایک نظم کا مذاق اڑایا تھا۔ وہ بھی اتنے مہذب پیرائے میں کہ دل کو ذرا بھی نہ لگی تمہاری تنقید۔۔ معافی مانگی۔ کچھ گردن جھکائے اور پھر لفافہ سا سینہ تان کر باریک ہونٹ بھینچ لئے نرم رقاصہ جیسی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے تم نے میری نظم مجھے دکھائی۔ ایک مصرع تم نے اپنی موٹی آواز میں دبوچ کر باریک ہونٹوں سے زبردستی آہستہ آہستہ جب میرے تصور کو آزاد کیا تو سچ مچ عین اس وقت میں نے بھی آزادی کا

سانس لیا تھا۔ اور بیچارا شعر تو ادھ موا ہو چکا تھا۔ دل میں میں نے سوچا تھا' کیسی عجیب طرح سے پڑھتا ہے یہ شخص۔ تم نے مجھے ترغیب دی کہ ردیف قافیہ کا پیچھا چھوڑ کر تو دیکھو لفظوں کے تسلسل کے لئے مشین کے بخیے کی طرح موتی گراتی چلی جاؤ گی۔ اور آغا شاعر کی بیٹی کی حیثیت سے میں نے بحث کی تھی۔ میرا دل ہی جانتا تھا کہ کیسی مجھے الجھن ہوتی تھی جب کبھی غزل کہنی پڑ جاتی۔ کاغذ کے کونوں پر لفظوں کے ڈھیر لگا دیتی مگر کوئی فٹ ہی نہ ہوتا تھا۔ کمبخت۔ آخر جھک مار کر نظم کا سہارا ڈھونڈ لیتی۔ بھلا خاندان کی آن کیسے لٹا دیتی آزاد نظم لکھ کر' اور بڑے طمطے سے کہے جاتی۔ جی ہاں آپ لوگ بندشوں سے بھاگتے ہیں۔

تم اکثر پوچھتے' بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈھ کر' کوئی نئی نظم لکھی؟ تمہاری آنکھیں مسکراتیں۔ اور میں اپنی کمزوری چھپاتے ہوئے آسان سا لقمہ توڑ کر تمہیں تھما دیتی۔ ہائے اللہ فرصت ہی نہیں ملتی کیا کروں۔ میرا وقت ہو گیا ہے میں جا رہی ہوں۔ تم چھوٹی سی میز پر جہاں تم بیٹھا کرتے تھے اپنی پانوں کی ڈبیا زور سے پٹختے۔ میں جاتے ہوئے بھی ایک بار پھر دیکھ لیتی۔ اردو ٹائپ کی ہوئی لمبی لمبی آزاد نظموں کے کتنے سکرپٹ (Script) تم کھول کر میرے سامنے رکھ دیتے۔ یہ کل میں نے نئی کہی ہیں اور میں ڈھٹائی سے ہار نہ مانتے ہوئے جلدی سے ریکارڈوں کا ڈبہ اور لاگ بک اٹھا کر اسٹوڈیو میں چلی جاتی۔ کمرے کی مدھم لائٹ میں سوچتی رہتی کہ یہ شخص اتنی جلدی کیسے لکھتا ہے۔ ایک روز کا گیپ دے کر کئی کئی نظمیں لکھ لاتا ہے۔ خدا جانے اندھیری راتوں میں دیسی گھرے کے نالیوں کے کناروں پر پاؤں پھیلائے تم کتنی نظمیں لکھ دیتے اگر تمہارے ندیم تمہارے ہم نوا تمہیں اپنے بازوؤں میں اٹھائے اکثر اسٹوڈیو یا ڈیوٹی روم میں نہ سلا جاتے۔ تم نے کیا لکھا۔ کیا کہا۔ کچھ جو باہوش رہے انہیں تم نے قلم بند کر لیا۔ باقی صبح تک کڑوی کسیلی قے میں تم بہا دیتے۔ اکثر صبح کی ڈیوٹی پر جب میں جاتی تو تمہیں ڈیوٹی روم میں آنکھیں ملتے ہوئے پاتی اور تم پر خاصا رحم آتا کہ جیسے تم یتیم ہو۔ جب تم اداس نظروں سے اپنے دوست کو دیکھتے جو دلی میں تمہارے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ جو ایکٹنگ میں خاصا مشہور تھا۔ واقعی ایکٹر تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ سنہری سنہری گھنے بال نہ جانے تمہیں دیکھ کر مجھے او سکر وائلڈ کا الفریڈ ڈگلس کیوں یاد آتا تھا۔ جیسے تم بھی شباب پسند ہو۔ مگر تمہارے چہرے پر رات بھر کی تلخی تمہارے شباب کی اداسی دن بھر تہ جمائے رہتی جس کا تم ہر نئی شام کو کڑوی کسیلی دوا سے گلا گھونٹتے رہتے۔ آج بھی وہی تخیل تمہارے چہرے پر پھیلی ہوئی دیکھ رہی ہوں۔ میں اور تم اس وقت بالکل اکیلے ہیں۔ میرے سامنے

میز پر کونے میں قطب مینار رکھی ہے۔ ننھی منی سی۔ قطب مینار کا ذکر اس لئے کر رہی ہوں کہ جب میں دلی میں تھی تو ہمیشہ اودی گھٹاؤں میں سوئی ہوئی اس مینار کو چھوڑ کر اونچے سرد کے درخت دیکھا کرتی تھی' اس بچاری کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے آم کے پیڑوں کی قطاروں میں آنکھ مچولی بھی کھیلی لیکن کبھی جو آنکھ اٹھا کر برسوں سے کھڑی اس مینار کو دیکھا ہو باہر کے لوگوں سے اگر اس کو چھٹکارا نصیب ہوتا تب کہیں اس کی برسوں سے رسی بسی ابابیلیں برسات کا موسم دیکھنے اتفاق سے باہر نکل آتیں مگر تم سچ پوچھو اب چار سال کے عرصے میں کس قدر پیار آتا ہے۔ ایک برتنوں کی دکان میں مینار جھانکتی ہوئی میں نے دیکھی۔ آنکھیں چار ہوئیں اور محبت امڈ پڑی۔ اس بوڑھے دکاندار نے میری آنکھوں کی چمک سے فائدہ اٹھایا۔ تمہاری تصویر کی طرح جو میرے ڈرائنگ روم میں لگی ہے' اس سرخ پتھر کی ننھی منی قطب مینار کو بھی اپنے ہاتھوں سے اسی طرح صاف کرتی ہوں۔ کیونکہ دونوں اصلی چیزیں میرے پاس نہیں ہیں۔ یہ ایک روز تم نے اپنی تصویر سے باہر نکل کر مجھ سے پوچھا تو تھا۔ ابھی ابھی میں نے دیکھا شیشے کی میز پر رکھی ہوئی یہ قطب مینار اتنی اونچی اٹھتی چلی گئی۔ سرد کے درخت وہی کاہی رنگ کا لباس پہنے ہوئے ہواؤں میں خاموش کھڑے ہیں۔ سرخ بجری کی روشوں کے چاروں طرف ہری ہری گھاس جس کی تازگی میری آنکھوں میں سچ مچ ٹھنڈک پہنچا رہی ہے۔ آم کے جھکے جھکے پیڑوں کی قطاریں جدھر مڑتی چلی جا رہی ہیں اور لمبی لمبی سڑکوں میں مل جاتی ہیں۔ پھر وہ سناٹا ہواؤں کی گود میں سرخ کاسنی پھولوں کے ڈھیر اڑاتا ہوا۔ مجھے اس مینار کے سامنے ایک سرخ عمارت کے سامنے لے آیا۔ یہ عمارت اس وقت کتنی ننھی منی تین دائروں میں میرے سامنے تبدیل ہو گئی۔ دودھ کے پیالوں میں روشنی کے بلب مجھے سیڑھیوں تک لے جا رہے ہیں۔ سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے اب میرا جی چاہ رہا ہے کہ اسی طرح بھاگنے لگوں کہ جیسے روز سیڑھیوں تک پہنچتے ہی میرے قدم خود بخود مجھے بھاگنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ یہ وہی تو ہے میرا پیارا ریڈیو اسٹیشن۔ وہ سب میرے پیارے پیارے دوست جو اس کتاب کی اونچائی کے اس طرف ہیں' کیا پتہ مجھے یاد بھی کرتے ہوں گے یا نہیں۔۔ کیا خبر مرنے کے بعد سب کو پیار آئے۔ جیسے آج کل سب کو تم سویٹ لگ رہے ہو۔

میں نے ایک آنکھ بند کر کے ابھی تم کو دیکھا کہ تم اسی طرح مسکرا رہے تھے۔ پتلے پتلے ہونٹوں میں کوئی بھی جنبش نہیں۔ چہرہ اسی طرح ساکت جیسے سینے سے ہزاروں طوفان آئے اور چہرے کو بھگوتے ہوئے چلے گئے۔ کٹورا سی آنکھیں گھورتی ہوئی جیسے تم نے پہلے دن سے گھورنا شروع کیا

تھا اور ابھی تک اسی طرح گھور رہے ہو۔ لمبے لمبے بال۔ مونچھوں اور داڑھی میں پھیلی ہوئی نگاہیں، پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ پتلیاں تک ٹھہر گئی تھیں۔ پتلے ہونٹ ایک دوسرے سے اس طرح چمٹ گئے تھے جیسے جبڑا تکلیف برداشت نہ کرتے ہوئے سارے دانتوں سمیت حلق کا راستہ پکڑ لے گا۔ ستوان ناک کے نتھنے شاید دو تین دفعہ ہی پھڑپھڑائے تو مجھے پتہ لگا کہ تم میں زندگی کے آثار ابھی باقی ہیں۔ گلے کی مالائیں ایک دوسرے سے چمٹی شیروانی کے کھلے گلے میں سانس کی رفتار کے ساتھ سر اٹھائیں اور پھر آہستہ آہستہ زرد سینے پر لوٹ جائیں۔ تمہارا دل بہت ہی محبت بھرا تھا۔ اس کی دھڑکن سے میں نے فوراً پہچان لیا۔ عجیب و غریب ماڈل کو دیکھ کر میں سنبھلی بھی نہ تھی کہ وشوا نے بتلایا کہ تم ایک لڑکی میرا کو چاہتے تھے۔

اس روز تمہاری مالائیں زرد سینے کے آغوش میں ڈوبے دل کی رفتار سے گلے ملتے ملتے مجھے تھکی تھکی لگیں۔ اور میں نے سوچا تھا کاش میرا تمہارا چہرہ نہ دیکھتی۔ کس قدر خشک اجاڑ ویران چمن اس میں آباد تھے۔ بنگال کی حسینہ کیا جانے اس خاموش ساکت دریا کی گہرائی کو۔ اسے تو طوفانی تلاطم میں ڈوبی گھٹائیں، آبشاروں میں ڈوبے گیت چاہئیں تھے اور بہار ہی بہار۔ مگر تم تو اپنے اندر سب کچھ جذب کئے بیٹھے رہے۔ اس دھڑکن کو کاش وہ دیکھ سکتی جو زرد سینے پر سر رکھے مالائیں بھی اب برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ تم مجھے گھورتے رہے۔ میں نے برا بھی مانا مگر وہ تو تمہاری عادت تھی۔ تم ہر عورت میں میرا کو ڈھونڈتے اور مجھے تم پر کبھی کبھی رحم بھی آجاتا۔

بیچارے میراجی کو اس لڑکی نے ڈانٹ دیا تھا۔ اس دن کے بعد وہ ان راہوں کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اور یہ اسی راستے پر اس کا انتظار کرتے رہے۔ اور اب تک کر رہے ہیں۔ وشوامتر عادل نے نوٹنے ہونے کے باوجود ایک سال کے معصوم بچے کا چہرہ لئے ہوئے اسی معصوم سی مسکراہٹ میں مجھے ایک روز بتلایا تھا۔ کتنا اچھا تھا وہ مجھے ابھی تک یاد آتا ہے۔ اتنا معصوم کہ بڑھیا سے بڑھیا سوٹ پہننے کے باوجود زیب قریشی کی تین چار وزنی کتابوں سے پٹ کر بھی خفا نہ ہوا۔ اسی طرح مسکراتا رہا۔ س کے پٹنے کے بعد میں دونوں "میراؤں" کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں وشوامتر مرے سامنے پٹا۔ کتابیں میرے سامنے بکھری پڑی تھیں۔ کچھ ورق علیحدہ ہو کر زیب کے جوتوں کے پاس پڑے تھے۔ اور کچھ دروازے کے قریب میراجی کے جوتوں کے نیچے پڑے سسک رہے تھے۔ میں ٹھاٹ سے بیچ کی کرسی میں ڈٹی بیٹھی رہی۔ زیب کسی فلم کی سائڈ ہیروئن لگ رہی تھی۔ غصہ سے کھلے گریبان سے اس کا گلابی گلابی سینہ وہ مالائیں مانگ رہا تھا جو

میراجی نے اپنے گلے میں ڈال رکھی تھیں۔ اور میرا ان کے سینے میں تڑپ رہی تھی۔ وشوامتر کے چہرے پر بچوں کی سی مسکراہٹ اور پھیلتی گئی۔ اپنی پیشانی پر بکھرے بال ہٹاتے ہوئے اس نے ہونٹوں کا سگریٹ ایش ٹرے میں مروڑ کر رکھ دیا۔ جس کے دھوئیں میں وہ میرا کو آنکھ بند کئے بلا کر لایا تھا۔ ساڑھی پہنے پتلی دبلی۔ دو چوٹیاں لمبی لمبی کمر سے نیچے لہرا رہی تھیں۔ سیندور کی بندی اس نے چمپئی چہرے پر ڈرتے ڈرتے لگائی تھی۔ ساون کی گھٹاؤں میں ڈوبے نینوں میں میراجی کے آنسوؤں کی چمک بھرنی چاہی تھی۔ اور میں میرا کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پوری طرح دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ میراجی کی پھٹی پھٹی نگاہوں اور بھاری بھاری قدموں سے وہ دنیا سے ڈرنے والی بزدل لڑکی ایک دم زیب کی چیخ سنتے ہی بھاگ گئی۔ پھر ایک دو تین دھڑا دھڑ وشوا کتابوں سے پٹتا رہا۔ وجہ یہ تھی کہ زیب وشوامتر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکی تھی اور وہ ڈیوٹی روم میں میرے پاس بیٹھا ہوا میراجی کے بارے میں اپنی معلومات ظاہر کر رہا تھا۔ وہ بات یوں ہوئی کہ میں نے پوچھ لیا۔ یہ عجیب کارٹون سے حضرت ہیں جب آتے ہیں تو ہر شخص کیسی محبت سے ان سے ملتا ہے۔ ن۔ م۔ راشد اور نظامی صاحب تو گویا ان کے بہت گہرے دوست ہیں۔ پھر وہ سارے ڈرامہ آرٹسٹ میراجی میراجی کرتے عاجز ہیں۔ یہ کون سی ہستی ہیں۔ خدا کے لئے بتاؤ۔ یہ لمبے بال 'مونچھیں' یہ لمبی لمبی مالائیں' یہ سب ہیئت کیا ہے۔ کیا یہ سب فراڈ ہے۔ اور وشوامتر عادل نے چائے منگا کر ایک کپ مجھے دیا۔ ان کا جغرافیہ ابھی پوری طرح بتایا بھی نہ تھا کہ لنچ کے لئے زیب ڈھونڈتی ڈیوٹی روم پہنچی۔ میں چونکہ نئی نئی داخل مکتب ہوئی تھی سوائے دو تین ہستیوں کے کسی کو نہ جانتی تھی۔ ابھی میراجی میں کچھ کچھ کشش پیدا ہوئی تھی جو راوی پٹ گیا میں خود شرمندہ تھی۔ ایک معصوم سی لڑکی میرے ذہن میں آئی تھی۔ میراجی پر رحم آیا ہی تھا کہ وشوامتر کی میرا نے سب کچھ بھلا دیا۔ پھر سامنے کھڑے میراجی مجھے اور عادل کو گھورتے رہے۔ جیسے ہم مجرم ہوں۔ میں پہلی دفعہ خود ہی میراجی سے بولی۔ بیٹھئے۔ وہ حیران ہوئے جیسے یقین نہ آیا ہو کہ میں نے اس سے بات کی ہے۔ پھیلے ہونٹ کچھ اور پھیلے تو دو لائنوں میں تبدیل ہو گئے۔ میں ان کی ٹھٹھری نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ کتنی چمک تھی ان میں۔ جیسے اندھیرے غار میں کوئی شکار کے لئے ٹکٹکی باندھے بیٹھا ہو۔ مجھے ان کا گھورتے رہنا بہت برا لگا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ اور الفاظ نہیں جڑ رہے ہوں۔ عجیب تذبذب تھا۔ میلی سی براؤن شیروانی 'کالر چکٹا ہوا۔ کہیں بھی تو تازگی نہ تھی۔ دو آنکھیں تھیں کہ پھٹی ہوئی تھیں۔ دماغ میں تلاطم تھا۔ الفاظ کھوئے چلے جا رہے تھے۔ اسٹوڈیوز سے گانے کی

آواز آرہی تھی۔ مورے مندر نہیں آئے۔۔ استاد فیاض خاں جے جے ونتی کا خیال گا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ تم نے مجھے گھورتے گھورتے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے تھک گئے ہو۔ پلکوں کے سائے میں میں آنسو گرتے دیکھتی رہی۔ سخت پریشان کہ الٰہی کیا ماجرا ہے۔ تم کیوں رو دیئے۔ کمرے میں گھوم کر وشوامتر کی کرسی دیکھی تو نہ وشوامتر تھا نہ زیب' صرف تم رو رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم مندر کی آواز نہ سن پائے تو پلکوں ہی پلکوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ آدھی آنکھ کھولے تم کرسی پر چند سیکنڈ لیٹے رہے۔ بیئے لفافے کے اتار چڑھاؤ سے مالائیں ملتی رہیں۔ اتنے میں ن۔ م۔ راشد صاحب آگئے۔ عینک کے پیچھے سے مخصوص مسکراہٹ لئے ہوئے جیسے وہ سب کچھ کھڑے سن رہے تھے دریچے کے قریب سے۔ میں سخت پریشان تھی کہ تم روئے کیوں' کیا وشوامتر کی باتیں سن رہے تھے شاید برا مانے تھے کہ وہ تمہارا راز کیوں بتا رہا تھا۔ مگر یہ سب غلط ثابت ہوا۔ راشد صاحب نے میری شکل دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیا۔ ساؤ سحاب کی حال اے۔ وہ اپنے پنجابی انداز میں بولے تم فوراً اٹھ کر جانے لگے تو انہوں نے کمر میں گھونسا مارا۔ میراجی' ریکارڈ تے ختم ہو گیا ہن کی جانا۔ ایس کڑی نوں وی حیران کر دتا! سحاب ان کے سامنے جے جے ونتی کبھی نہ بجانا۔ یہ ساری رات روتے رہیں گے۔ ابھی تو تم بیٹھی تھیں یہ اپنے کمرے میں جا کر رات بھر رو سکتے ہیں۔ مجھے وشوامتر کی ساری باتیں پھر سے یاد آنے لگیں۔ کیا مرد بھی اتنا چاہتا ہے کسی کو' کیا پتہ 'اندر سے کوئی جواب نہ مل سکا۔ "میرا" تم کتنی خوش قسمت ہو۔ تمہیں معلوم ہو جائے تو اس دھرتی پا پاؤں نہ رکھ سکو۔ میرا جے جے ونتی میں خود اداس ہو گی۔ سب کو چھوڑ کر میں وہ ریکارڈ اندر لے گئی۔ اور ایک بار نہیں تین چار بار بجایا۔ کیا بتاؤں جی چاہا تمہیں کھینچ کر لے آؤں تاکہ تم خوب رو لو جی بھر کے۔ اسٹوڈیو کی مدھم لائٹ میں موٹے موٹے نرم مخمل کے پردوں سے ڈھکی دیواروں سے جب یہ اداس راگ پھوٹتا تو جیسے سارے کمرے میں میرا کے شریر میں میری روح گھبرا رہی تھی۔ میراجی چاہا کہ کہوں اچھا ہوا تمہیں وہ نہیں ملی تبھی تو تم میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ ورنہ مشین کا پرزہ بن جاتے۔ زنجیر کا حلقہ بن جاتے۔ اسی طرح زنگ چڑھتا تم پر بھی۔ اب کم سے کم ایک کرب گلے لگائے ہوئے تو اس دنیا سے گئے ہو۔ تم نے سوچا تو بہت تھا کہ میرا تمہیں اس دنیا میں ضرور ملے گی چاہے وہ کسی روپ میں آئے۔ تم ہر عورت کو گھورتے رہے گھورتے رہے۔ رات بھر وِیسی ٹھرے سے پیاسا حلق تر کرتے رہے۔ میرا کا جسم ابھر آتا۔ تم اس

13603

کے ہر ہر سانس کا اتار چڑھاؤ جو آنکھوں میں سارا دن چھپائے رہتے، چپکے چپکے اپنے ہم نواؤں، ہم جنسوں کے سامنے ننگا کر کے ڈال دیتے۔ تم بھی جھوم اٹھتے۔ اور وہ بھی قہقہے لگاتے واہ میراجی کیا جینیئس پیدا کیا اللہ میاں، پھر تمہیں گودیوں میں اٹھائے یتیم خانے میں ڈال جاتے۔ اکثر صبح کو ڈیوٹی روم کے پاس ویٹنگ روم میں تم آنکھیں ملتے نظر آتے۔ دس بجے جب میں ڈیوٹی سے واپس کمروں میں سے گزرتی تو تم بھی مجھے نئی نئی نظمیں سنانے کے بہانے بلاتے۔ دیکھو یہ کل رات نئی نظم لکھی۔ یہ پرسوں لکھی۔ یہ ابھی پوری نہیں ہوئی۔ بات بتاؤں کہنا نہیں کسی سے۔ یہ جو اوبتا ہے نا یہ اس پر لکھی ہے۔ یہ جو اپرنا ہے تھوڑی سی یہ اس میں نظر آتی ہے۔ یہ "وہ" ہیں۔ وہ صیغہ راز تھی۔ جن کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ آنکھیں جتنی معصوم ہیں اتنی وہ خود نہ تھی۔ انہیں ہمیشہ لڑائی کے پارٹ دیئے جاتے۔ وہ خوب تو تڑاخ سے جواب دینے میں ماہر تھیں۔ سنا تھا کہ تم کو وہ اتنی پسند آئیں کہ تم نے اپنے بہت عزیز دوست کے ذریعے پیغام بھی بھیجا۔ سب نے سنا اور خاموش رہے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ تمہاری بیوی بنی تو کرائے کی پتلون تو تمہیں پہننے کو مل جائے گی۔ ایک آدھ مرے ہوئے گورے کی ٹائی بھی وہ خرید کر تمہیں بندھوائے گی اور رات خدا جانے نالیوں کے کنارے تم نظمیں لکھ سکو گے یا "وہ" تمہیں کسی باغ میں بٹھا کر نہ چلی جائے۔ ایک فائدہ تھا ہر روز کسی نئی گاڑی میں تمہیں مفت لفٹ ملتی۔ خاصے معقول تو بن جاتے تم... تم نے نہ جانے کیا کیا سوچا ہوگا۔ سنا تھا جب انہوں نے یہ مژدہ سنا تو ایک انگلی اپنے ہونٹ پر رکھی جو خاصی دیر کانپتی رہی۔ وہ تل جو سیاہ آنکھ کے نیچے زرد رخسار پر چمکا کرتا تھا جو تمہیں بہت پسند تھا وہ سچ مانو لرز گیا۔ کچھ دیر تو وہ آنکھیں پھاڑے اس دنیا میں نہ رہی جب واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ڈرامہ میں لڑائی کے پارٹ کے رہرسل کرتی نظر آتی۔ وہ الفاظ تو تم نے بھی سنے تھے تم نے کئی روز دیسی بھی نہ پی کھانا بھی نہ کھایا۔ جے جے ونتی کا ریکارڈ سنے بغیر روتے رہے۔ تمہارے کیا میرے ذہن میں اب تک گونج رہے ہیں وہ الفاظ موا شاعر بونا پھرتا ہے۔ تبھی رہرسل میں مجھے پان دیتا اور جب دیکھو گھورتا رہتا۔ کہاں گیا وہ "میرا" کا عشق۔ تبھی اس نے منہ نہ لگایا شکل تو دیکھو داڑھی بڑھائے موا جوگی۔ اور سنو بہن میری قسمت میں یہی لکھا ہے کیا۔ سب نے ہی سنا۔ کچھ ہنس دیئے۔ کچھ اداس، کچھ حیران، مجھے تو جیسے معلوم تھا کہ ایسا سوچنا بیکار ہے۔ کوئی جوڑ ہی نہیں تھا تمہارا اور ان کا سوائے پان کھانے کی عادت کے۔ اگر نکاح برقرار رہتا تو شوق پورا کر لیتے۔ سچ سچ تم کو رنج پہنچا۔ لوگ "میرا" کو ہی سمجھ رہے تھے جو مذاق مذاق میں تم نے "انہیں"

بھی جگہ دلائی۔ اس لفافے سے بینے کے اندر سے قدرت اور بھی مسکرائی۔ مسکراتی رہی۔ اب کے بھی وہ جیت گئی۔ تم ہار کر اتنے تھک گئے تھے کہ کسی نے کہا آٹھ روز تک تم نے کچھ بھی نہ کھایا، شراب پیتے رہتے رات رات بھر۔ خوب نظمیں لکھیں۔ تم نے دھڑا دھڑ۔ عورت سے تم خفا ہو گئے۔ میں سب کچھ دیکھتی رہی۔ سنتی رہی۔ تم مجھ سے کبھی کبھی بحث ضرور کرتے۔ میں بڑی صفائی سے عورت کی طرف سے لڑتی۔ گو میں خود شرمسار تھی۔ اپنی ہم جنسوں کو دیکھتی اور ریشمی پردے ڈالتی چلی جاتی۔ تم جب پندرہ بیس دن کی چھٹی کے بعد واپس آئے تو لوگ میراجی کو نہ پہچان سکے۔ تمہیں احساس ہو گیا تھا۔ سب ظاہر داری کو پسند کرتے ہیں۔ وہ دن گئے جب راکھ میں جٹی زلفیں گلے میں پڑی مالاؤں میں سندریاں لپٹ جاتی تھیں۔ بھگوان کے پاس جانے کا راستہ ڈھونڈ لیتی تھیں۔ تم کو جب میں نے دیکھا تم رتناولی ڈرامے کی ریہرسل کرا رہے تھے۔ جو تم نے لکھا تھا منظوم ڈرامہ اور تم نے رتناولی کے لئے انہی کو چنا۔ سب مسکراتے۔

تم کو کیا بروگ تھا۔ لمبے لمبے بال داڑھی سب غائب۔ کینچلی تو تم نے لاکھ بدل ڈالی پر تمہارے پچکے ہوئے رخسار۔ پتلی سی گردن۔ سارے چہرے پر صرف آنکھیں ایسی تھیں جو وہی پرانی دیکھی دیکھی سی۔ جنہیں دیکھ کر لوگ میراجی کہہ اٹھتے تھے۔ مگر یہ روپ بھی سب بیکار ثابت ہوا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تمہارے پان اسی طرح مسکرا مسکرا کر کھاتی رہیں۔ ہر رات تم اس لرزتے تل کا ذکر ضرور کر لیتے۔ جے جے ونتی سن کر ساری ساری رات روتے بھی رہتے۔ مجھے ہر نئی نظم ضرور کار میں بیٹھے بیٹھے سننے کے بعد بھی میں نے کئی بار محسوس کی۔ اس وقت تم جانتے ہی ہو۔ چار سال سے اسی کمرے میں جس میں تمہارا فوٹو ٹانگ رکھا ہے۔ مجھے تم پر اب خاصا رحم آتا ہے تم نے کیا کیا نہ دیکھا اس کمرے میں۔ اس کے بہ راس کراچی شہر میں ایک ریڈیو اسٹیشن اب بھی ہے "وہ" اب بھی پارٹ کرتی ہے۔ ان کے لہجے میں اب اور بھی تلخی درشتی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے مدت سے نہیں دیکھا۔ سنا ہے اب وہ بہت سے بچوں کی اماں ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم بچوں کے ابا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں تم بمبئی میں تھے تو... کیا کیا نہ ہوا تمہارے ساتھ۔ کئی کئی روز تم بھوکے رہے۔ کئی راتیں تم نے گلیوں سڑکوں پر ٹہل کر گزار دیں۔ حلق پیاس سے چٹختا رہا۔ اور جن لوگوں کو تم پر آج کل پیار آ رہا ہے کئی صفحے کالے کر ڈالے تم پر۔ وہ رات بھر تمہیں دیسی شراب بھی نہ پلا سکے۔ ایک وقت کھانا بھی نہ کھلا سکے۔ اب کہتے ہیں زمانے نے ایک ذہین شاعر ختم کر دیا۔ تم تو اسی طرح کراہ رہے ہو۔ کبھی تو اپنی نئی نظم چھپ کر سنا کرو۔ تم کیسے ہو۔ آؤ میں

تمہاری روح کو ایک بار گلے لگا لوں۔ تمہاری روح کتنی اداس، کتنی سوگوار اور پیاری ہے۔ تمہاری بھوک تمہارے چہرے کو اپنی گندگی میں لتھیڑتی رہی۔ کسی نے اسے اتار کر پھینکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ آج میں نے محسوس کیا جیسے تمہاری روح میرے کتنے قریب ہے، کتنی مقدس، کتنی حسین و معصوم۔ ایک باز میرے قریب آؤ۔ دیکھو میری روح کتنی اداس ہے۔ میں تمہاری تصویر اٹھا کر یہ لو پھینک دیتی ہوں۔ سخت منحوس ہے تم خود کتنے اچھے تھے۔ ناحق یہ خول عمر بھر چڑھائے رہے۔ جھوٹے لفظوں کا کفن پہنے پھرتے رہے۔ تم کتنے بدل گئے ہو ذرا بھی نرمی خودداری تم میں نہیں رہی۔ دور کھڑے ہو۔ وہ تو خبطی تم سدا کے ہی ہو ورنہ۔۔۔ آج قدرت تم سے شرمندہ نہ ہوتی۔ گئے نا دودھ کی نہروں کے پاس ٹہلنے کو، حوریں میووں کی قابیں لئے تمہارے حضور میں ہیں۔ شراب طہور سے لبریز مینائیں لئے۔ اب لکھو نا نظمیں ان کے حسن پر! قدرت کی ثناء خوانی نہیں کرتے اب کیا ہوا جو یہ کشکول لئے پھر دھرتی پر اتر آئے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو کہ میرا ذہن تھک چکا ہے۔ یہ تم نے میری آٹو گراف بک پر جو شعر لکھا تھا' یہ میرے سامنے کھلی پڑی ہے۔ آٹو گراف آج میں اس کا مطلب سمجھ سکی ہوں۔۔۔۔
"قدرت بڑی حسین اداکارہ ہے۔"

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے!
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

ن۔ م۔ راشد

ن۔ م۔ راشد

آج صبح راشد صاحب کو جلا دیا گیا!!

ضیاء تمہاری آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ مولا ایسا کیسے ہو گیا۔ یعنی راشد صاحب کو جلا دیا گیا۔ تم لوگ دیکھتے رہے۔ کسی نے کچھ نہ کیا۔ اعجاز چپ چاپ کھڑا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کو بھی مجھ سے شکایت ہو۔ میراجی اسی طرح میلے کچیلے کپڑوں میں اسٹوڈیو کے باہر کھڑے سردی سے کانپ رہے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر ایک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یار سحاب تم لوگ کیسے ادیب ہو۔ سب کے سب لندن میں بیٹھے رہے۔ راشد کو جلوا دیا۔ وہ ہماری امانت تھا۔ ادیبوں کی ایک میٹنگ کر لی ہوتی۔ کہاں گئے وہ سب ادیب شاعر جو تمہارے گھر میں شعر سن سن کر سر دھنا کرتے تھے۔ وہ لوگ کچھ بھی نہ کر سکے۔ تمہارا عبداللہ حسین، ساقی تم اور سینکڑوں شاعر و ادیب ہیں لندن میں۔ کسی نے راشد کی بیوی سے نہیں کہا کہ یہ تمہارا حق تو ہے۔ مگر وہ ہمارا شاعر بھی ہے۔ اس کو مت جلاؤ۔

یہ دلی کا ریڈیو اسٹیشن تھا اور میں بھی سردی سے کانپ رہی تھی۔ دلی کے ریڈیو اسٹیشن کے کوریڈور میں استاد عبدالکریم خان کے اسٹیچو کے پاس ہم سب کھڑے تھے۔ اگر میں اتنے زور سے نہ روتی جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ لندن کی ٹھنڈ سے میں کانپ رہی تھی۔ کیسا اچھا خواب تھا۔ رات کو بے چین سوئی تھی۔ کاش میں اور بھی دیکھتی۔ میراجی کو برسوں بعد خواب میں دیکھا۔ راشد صاحب۔ آل انڈیا ریڈیو اور ادھر یہ لندن کی ٹھنڈی برفیلی صبح۔

کل رات سے میں کتنی بے چین ہوں۔ رات کا جان لیوا ٹیلیفون پھر یاد آیا۔ مجھے سب یاد آ گیا۔

نو اکتوبر کی رات کے دس بجے عبداللہ حسین نے ٹیلیفون کیا۔ سحاب میں عبداللہ ہوں۔ سنو ایک دردناک خبر۔ راشد صاحب کا آج شام اپنی ساس کے گھر میں انتقال ہو گیا۔

عبداللہ بڑی نرم آواز میں دکھ سے بول رہا تھا۔ عبداللہ تم کہاں سے بول رہے ہو۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا راشد صاحب کہاں تھے۔ مجھے ساقی نے بتایا ہے ابھی ابھی وہ ساقی کے گھر رات کو آنے والے تھے ساس کے گھر سے ہو کر۔ شیلا دو دن سے اٹلی گئی ہوئی ہے۔ وہ ساس کے پاس آئے وہ کافی لائیں۔ اور پیتے ہی سر جھک گیا۔ ان کی ساس نے ساقی کو فون کیا۔ ہم دونوں ٹیلیفون پکڑے چپ تھے۔ میں نے عبداللہ کو یہ بھی نہیں بتایا کہ ابھی دو دن پہلے رات کے دس بجے راشد صاحب نے ٹیلیفون کیا تھا۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے کہ میں نے اعجاز کو زبردستی راشد صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ اور اعجاز پیارا ان کی کتاب کا مسودہ لے گیا۔۔ اسی دن پدماچ دیو کے گھر کھانے پر میں اعجاز کو لئے جا رہی تھی۔

بقول اعجاز اتنے پونڈ خرچ کئے میں نے۔ پھر ہم دونوں بارکنگ کا لمبا سفر ٹرین میں کر رہے تھے۔ تو راشد کی باتیں کرتے رہے۔

تم ضرور جاؤ۔ وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں ان کی کتاب چھپوا دو۔ وہ اندر سے بڑے رنجیدہ ہیں۔ مجھے پاکستان کے ادیب گھاس نہیں ڈالتے۔ تم جاؤ ان کی تسلی ہو جائے گی۔ ان کا مسودہ لے جاؤ تاکہ ان کی کتاب آجائے۔ پھر ہم آل انڈیا ریڈیو کی باتیں' راشد صاحب اور میراجی کی باتیں کرتے رہے۔ اعجاز کو اعتراض تھا کہ شیلا نے اتنی دور گھر کیوں لیا۔ راشد صاحب کی ساری عمر کی کمائی سے گھر خرید لیا۔ لندن سے دور' یہ برا کیا مائی نے۔

اعجاز غصے میں تقریر کر رہا تھا۔

راشد صاحب تو سٹھیا گئے ہیں۔ بڑھاپے میں۔ شیلا میم صاحب جو کہتی ہیں۔ وہی کرتے ہیں۔ بظاہر اکیلے نہیں رہ سکتے۔ پاکستان واپس کیوں نہیں آتے۔ ان کو سب سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ ان کا اپنا ملک ہے۔ ان کا شہر جہاں پیدا ہوئے۔ واپس آجائیں۔ انہیں لکھنا چاہئے۔ اس کے لئے اپنے لوگوں سے ملنا بہت ضروری ہے۔ وہ خود تنگ آچکے ہیں۔ اعجاز اسی موضوع پر باتیں کرتا رہا۔ پاکستان واپس آجانا چاہئے تھا۔ راشد نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے۔ ہمارے لوگ بھول گئے۔ راشد کو۔ مگر جب چیزیں چھپ گئیں تو لوگ پھر سے پیار کریں گے۔

اعجاز! اگر اتنا خیال ہے تمہیں تو ایک روز کے لئے چھ پاؤنڈ خرچ کر کے چلے جاؤ۔ وہ بڑے تنہا

ہیں۔ پاکستان سے وہ محبت کرتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی رات کو ٹیلیفون کرتے ہیں۔ جب بہت اداس ہوتے ہیں۔ ایک تو آہستہ آہستہ سے باتیں کرتے ہیں۔ پھر پیچھے سے خاتون کے ذہن میں ٹیلیفون کے بل کے اضافے کا کمپیوٹر لگا ہوا ہوتا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اچھا بھئی بہت باتیں کرلیں۔ شیلا تم کو پیار کہہ رہی ہے۔ اکثر میں خود کہہ دیتی تھی۔ راشد صاحب آپ رکھیئے ٹیلیفون میں کرتی ہوں تو شرمندہ ہو جاتے۔ ہاں بھئی یہ گھر اتنی دور ہے کمبخت پیسے تو تمہارے بھی لگیں گے۔ "تو بڑی ڈاہڈی ہے"۔ اور ہنستے رہتے۔ اور پھر پرانے لوگوں کی باتیں۔ وہ اکثر رات کو جب تنہا ہوتے تو ٹیلیفون پر ٹھرک جھاڑ لیا کرتے تھے۔ پرانے قصوں میں "مسز حسین" کو ضرور یاد کرتے۔ میراجی' زیب قریشی' درشا کا ذکر اکثر ہو جاتا۔ وشوامتر عادل' دگل صاحب اور منٹو سے تو ان کی محبت چڑ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

صبح ہی صبح حبیب حیدر آبادی کی رندھی ہوئی آواز آئی۔ سحاب کچھ کرو نا۔ ساقی نے بتایا میری شیلا سے بات بھی ہوئی۔ وہ آج صبح دس بجے راشد صاحب کو جلوا دیں گی۔ انگریزی کے لفظ Cremation میں اتنی بے رحمی نہ تھی جتنی کہ اردو ترجمے میں اور مجھے لگا کہ میں خود جلنے والی ہوں۔ تیاری ہو رہی ہے اور میں نے صبح آٹھ بجے دولتانہ صاحب (جو ان دنوں پاکستان کے سفیر تھے لندن میں) کو ٹیلیفون کر دیا۔

دولتانہ صاحب! راشد صاحب اکیلے شیلا کے شوہر ہی نہ تھے۔ وہ ہمارے ادب کا حصہ بھی ہیں۔ دولتانہ صاحب خدا کے لئے کچھ کیجئے۔ وہ ہمارے ادیب و شاعر بھی ہیں۔ وہ سب سنتے رہے اور آہستہ سے کہا کہ سحاب میں قیوم کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔ (پریس کونسلر) جلدی سے وہ بلجیم میں راشد کے بیٹے شہریار سے Contact کریں جو پیرس میں ہیں۔

شاید کوئی تدبیر نکلے۔ میرے رونے پر۔ انہوں نے بیگم دولتانہ کو ٹیلیفون پکڑا دیا۔ جن سے اپوا کی وجہ سے بے تکلفی بھی تھی۔ میں بے قرار ہو گئی۔ کچھ کیجئے۔ اللہ۔ آج صبح دس بج کر چالیس منٹ پر شیلا۔ ساقی۔ عبداللہ حسین اور دو ایک دوست جا رہے ہیں۔ وہ سب ان کو جلا دیں گے۔ ان کی لکھی ہوئے وصیت کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ لوگ ان سے وصیت کے بارے میں پوچھئے کہ وصیت لکھی ہوئی دکھائیں۔ جلدی کیجئے آپ کو کچھ کرنا چاہئے۔

اور پھر کچھ نہ ہوا۔ راشد صاحب کی بیوی شیلا نے' شاعر مغرب نے نئی نسلوں کے مصنف عبداللہ حسین اور کئی سرپھرے لوگوں نے ماورا کے ن۔ م۔ راشد کو جلوا دیا۔ شاعری کو جدید موڑ

پرلے جانے والا۔ خالق۔ میراجی کو دوڑ میں اول آنے سے ہمیشہ ہی روکتا رہا۔ اور جیت گیا۔ اور تہلکہ مچا گیا۔

تاک کی شاخ بھی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھی
کیسے زنبور ہمیشہ سے تمنا کے خداؤں کے حضور

اس بڑے حادثے پر جس کا کرب چار دن سے سوار ہے۔ میری روح جانکنی میں تھی اب تک۔ نو اکتوبر کی رات کو راشد صاحب اپنی ساس کے گھر میں کرسی پر بیٹھے تھے چپکے سے فرار ہو گئے۔ ماوراوالے ن۔ م۔ راشد۔ وہ راشد صاحب جو آل انڈیا کے انڈرہل (UnderHill) روڈ پر پرانے ریڈیو اسٹیشن کے ایک شکستہ سے برآمدے میں اڈوانی صاحب کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس روز مجھے ان کی مسکراہٹ اچھی لگی تھی۔ ذہین آنکھیں۔ ابھی کھڑی۔ یہی سوچ رہی تھی، مجھے اس وقت کا تصور۔ کیسا روئی کے گالوں میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ دھندہی دھند میں ڈوبے ہوئے راشد صاحب یاد ہیں۔ کہ یہ بولتے کیسے ہیں۔ لفظوں کو دھیرے دھیرے سیدھی لائنوں میں جماتے تھے۔ آواز کی تہہ میں کہ کہیں بے ترتیب نہ ہو جائیں۔ لفظ 'اونچ' 'نیچ' نہ بیٹھیں۔ لفظوں کی ساخت میں خوبصورتی تھی۔ اور ان کے بولنے میں۔ پردے کے پیچھے سے بھی اگر بولتے تو میں پہچان لیتی۔ ان کی آواز۔ ان کا لہجہ' صرف ہنسی میں معصومیت اور کنوارپن تھا۔ جو اصلی تھا۔ ان کی مسکراہٹ کو ابھی تک آنچ نہیں لگی تھی۔ پہلی بار راشد صاحب ریڈیو پر مجھے ملے۔ اور انہوں نے کہا۔ تم آغا صاحب کی بیٹی ہو۔ سحاب۔ خوب نام ہے اور پیچھے سے ایک اور گمبھیر اندھیرے میں ڈوبی ڈوبی آواز آئی۔ سحاب۔ بدلی ہی بدلی۔ اور ہونٹ پھر ایک دوسرے سے چمٹ کر غائب ہو گئے۔ ضبط کا تشدد چہرے کو تپا رہا تھا۔ یہ تھے میراجی۔ شیروانی میں ٹھن ٹھن کرتا جسم جیسے ٹین پر شیروانی پہنادی ہو۔ ہاتھ میں لوہے کے گولے لئے۔ چہرے اور جذبات پر قابو۔ کیسے گھورتے رہے تھے۔ ہاتھ کے انگلیوں پر پھیلی ہوئی رگیں۔ تو یہ تھے۔ میراجی اور ادھر یہ ان کے ساتھی ن۔ م۔ راشد۔ ساری ہی عمر جلائے بیٹھے رہے اندر آگ جس کی تپش اور روشنی میں وہ کھو گئے۔ کیسے بے تعلق سے چپ چاپ اپنی روح کو چھپا کر لے گئے۔ روح کی فرقت کا دکھ چہرے پر بکھرنے ہی نہیں دیا۔ تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ کسی کو خبر تک نہ ہونے دی۔ سنا تھا کہ کرسی پر بیٹھے۔ کافی پی اور چپ چاپ فرار ہو گئے۔ میراجی یاد ہے تم کہا کرتے تھے۔ یہ راشد حاسد ہے۔ کہتا پھرتا

ہے کہ لوگ اس کو جانتے ہیں یا مجھ کو۔ ن۔ م۔ راشد۔ یا میراجی۔ میراجی تم بھی سکتے میں آگئے نا۔ اس ڈرامے کے اختتام پر۔ اب کیسے حیرت سے سمٹے کھڑے ہو۔ پتلے باریک ہونٹوں کی کمان چپکائے۔ جو تمہاری عادت تھی۔ آنکھیں کھولے۔ جن میں سناٹے ہی سناٹے بھرے ہیں۔ اب تو کوئی پوشیدہ راشد تمہاری آنکھوں میں نہیں۔ میراجی بولو۔ راشد صاحب کو شعلوں کی نذر کر دیا۔ وہ ختم ہو گئے۔ اب اس جدید راہ پر کون چلے گا۔ کہتے تھے۔ مجھے میرے لوگ نہیں چاہتے۔ دیکھا لوگ بے قرار ہیں۔ تمہارے لئے آج۔ لندن کے ٹھنڈی یخ رات کو چار بجے میں اپنے پلنگ پر تنہا لیٹی یہ سوچ رہی ہوں۔ ابھی میری ہچکیوں سے آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسی میری روح چھلاوہ ہے۔ جب چاہتی ہے کہاں کہاں پھر آئی ہے۔ اور پھر مجھے رو تا چھوڑ۔ کتنی عزیز روحوں کے پاس ہو کر آ بھی گئی۔ یا یہ سب جذبہ شوق ہے یا میرے ذہن کی کرامات ہے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔ کل صبح جب میں چائے بنا کر لائی تو گیس کے چولھے کی سفید چمکیلی سرخ لپکتی ہوئی آگ پر میں نے انگلی لگائی۔ پھر چائے کی کیتلی کو اٹھا کر نیچے پورا ہاتھ چند لمحوں کے لئے رکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہائے ظالموں نے کتنا ظلم کیا۔ میرے شاعر کو جلا دیا۔ اگر میں کسی سے کہوں کہ اپنے ہاتھ کو جلا دو۔ وہ جو مشاہدہ کرنے گئے تھے۔

اپنے کمرے میں پلنگ کے پاس کھڑی کھڑکی کے باہر سرخ چھتوں کے گھر یاد دلا رہے ہیں کہ میں لندن میں اکیلی ہوں۔ اتنی دور دیار غیر میں کوئی اپنا نہیں۔ کسی کے جنازے پہ کوئی پڑھنے والا نہیں۔ روشنی سے جگمگاتی یہ ٹھنڈی رت جو راشد صاحب کے پاس سے تنہا گزر رہی ہے۔ میں اتنی دور سے کچھ بھی نہ کر سکی۔ قرآن شریف پڑھوں۔ اس سوچ کے ساتھ ہی ان کا مسکراتا چہرہ سامنے آ گیا۔ پگلی ان باتوں سے کیا فائدہ۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ وہ جسم جسے گلے لگایا۔ چوما جب تک محبت کی گرمی رہی۔ پھولوں کی طرح قربت رکھو جب روح بے وفائی کر کے جسم کا ساتھ چھوڑ دے تو چاہے دبا دو یا جلا دو۔ بیکار چیزوں کو پھینک ہی تو دیتے ہیں۔ ویسے اسپرنگ کلینگ (Spring Cleaning) انگریز بیویاں اکثر و بیشتر ہی کر دیتی ہیں۔ اور واقعی شیلا نے اسی بہار کے موسم میں ان سے ہمیشہ کے لئے گھر صاف کر دیا۔ میں نے ایک جگہ ایک نظم پڑھی تھی راشد صاحب کو کسی پارٹی میں جس کا مفہوم سمجھایا تھا۔ جس پر خوب ہنسے اور مجھے طعنہ بھی دیا برجستہ جو ساری پارٹی میں فقرہ مشہور ہو گیا۔ اور آج میں بھی ان کو واپس کر رہی ہوں۔ ریڈیو کے لوگ فقروں پر زندہ رہتے ہیں۔ اس کی لذت وہی جانتے ہیں جو ریڈیو میں رہ چکے ہوں۔ (Cleaning

(Spring) گرمیوں کا شروع بہار کا زمانہ سرد ملکوں میں بسنت کا زمانہ ہوتا تھا۔ ہماری عورتیں بسنتی ساڑیاں ڈوپٹے رنگتی ہیں۔ پھول لگاتی ہیں۔ پیا کو رجھانے کے لئے۔ اور ادھر یہاں جس ملک میں۔ میں رہتی ہوں۔ گھر صاف ہوتے ہیں۔ باہر اندر رنگ و روغن کرتے ہیں۔ اور کچھ خواتین اپنے مکینوں سے تنگ آکر ان کا سامان خود ان کے سمیت باہر پھینک دیتی ہیں۔ ہر نئی چیز کی چاہنے والی نے اسی طرح ایک انگریزی نظم میں جو جدید لکھنے والی "مس سوزن" کی تھی میں نے انہیں ترجمہ کرکے سنائی۔ جوسن کے بہت محظوظ ہوئے {

اب کے بہار میں میرے کمرے میں ہر چیز نئی ہوگی
خزاں کے موسم کی طرح تم بھی میری زندگی سے چلے گئے

اس بہار کے موسم میں، میں نے گھر کی صفائی کی۔ باتھ روم سے تمام تمہارے برش وغیرہ، الماری سے تمہارے جوتے کپڑے، سب ڈسٹ بن میں آج پھینک دیئے۔ ڈارلنگ، معاف کرنا۔ اب تم اس گھر میں بھی نہیں آسکتے۔ کیونکہ میں نے تالا بدل لیا ہے۔ اس جدید زمانے کی چاہت ماوراکے مصنف سے بازی لے گئی۔

راشد صاحب ہنس پڑے کاش ہماری عورتیں بھی ایک دو سال بعد (Cleaning Spring) کرڈالیں تو ہم سب کا بھلا ہو جائے۔

ایک زمانے میں یو۔ این کی نوکری نے انہیں مصروف کر دیا تھا۔ فوجی یونیفارم کے زمانے میں ان کی شخصیت پر کلف چڑھ گیا تھا۔ لوگ ملتے اور کہتے، راشد بڑے مغرور ہو گئے، مگر مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا۔ میرے لئے وہی راشد صاحب رہے۔ ایران سے انہوں نے ایک خط مجھے لکھا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اپنے اثاثے میں رکھا تھا اس کو بھی۔۔ مگر وہ بھی تلف ہو گیا۔ ہندوستان کے گھر میں۔ اور سامان کے ساتھ۔ سحاب بی بی۔ کل تم دوپہر کو یاد آئیں۔ میں چپ چاپ شاہراہ حافظ پر جا رہا تھا۔ میرے پیچھے دبے دبے قہقہے جیسے کوئی صراحی سے مئے انڈیل رہا ہو۔ ایسی مترنم آوازیں فقرے جیسے بلوری چوڑیاں ٹوٹ کر پے در پے زمین پر گر رہی ہوں۔ پلٹ کر دیکھا تو سرد کے درخت کے سائے جیسے جسم چل رہے تھے۔ دونوں درختوں کے تنوں کے پیچھے چھپ گئے۔ نہ جانے تم مجھے کیوں یاد آئیں۔ تمہاری آواز۔ گھر آکر فوراً ریڈیو کے پتے پر تم کو خط لکھ رہا ہوں۔ یقین آجائے گا۔ تیری آواز کے اور مدینے۔۔۔ ہم ابھی تک یاد رکھتے ہیں۔

میری طرف سے اپنے آپ کو پیار کرو۔ ارباب کشور من رابوس امید ہے تم نے میری نظم جو فوجی پروگرام سن کے میں لکھی تھی۔ پڑھی ہوگی۔ فوجی پروگرام کے لئے "آواز۔ رائے ضرور لکھنا۔" ان کا کیا حال ہے؟۔ بقول تمہارے وہ اور لوگوں کے تلفظ ٹھیک کر رہی ہیں نظم کا عنوان ہے "آواز"

یہ دلی ہے
اپنے غریب الوطن بھائیوں کے لئے
ہار غزلوں کے لائی ہے ان کی بہن
اور گیتوں کے گجرے بنا کر
"چھما چھم چھما چھم دلہنیا چلی رے"
"یہ دنیا ہے طوفان میل"
"تری زلفیں ہمیں ڈس گئیں ناگ بن کر"
مگر اس صدا سے بڑا ناگ ممکن ہے
جو لے گیا ایک پل میں
ہزاروں کو غار فراموشگاری
میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے
کہ صدیاں گزرنے پر ان کی
یہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی؟
جہاں سے یہ آواز آئی
اسی سرزمین میں
سمندر کے ساحل پہ' لاکھوں گھروں میں
دیئے ٹمٹمانے لگے
اور اک دوسرے سے
بہت دھیمی سرگوشیوں میں
یہ کہنے لگے
لو سنو' اب سحر ہونے والی ہے لیکن

مسافر کی اب تک خبر بھی نہیں ہے!

راشد صاحب۔ تو مجھے پتہ لگا کہ اس سارے خط کا لب لباب میدہ شہاب چہرہ تھا۔ جواب بھی راشد صاحب کے ساتھ ہے۔ ایران میں بھی راشد صاحب ویسے ہی پیاسے رہے۔ اور ادھر وہ گھبرا گھبرا کر تین بار اپنے سہرے کے پھول کھلا چکی تھیں۔

مجھے کیا پتہ یہ آخری ٹیلیفون تھا۔ دل رکا رکا سا تھا۔ سحاب تمہارا شکریہ۔ تم نے میرا ٹیلیفون نمبر اعجاز کو دیا۔ میں دو دن اعجاز سے ملا۔ بڑا اچھا وقت گزرا تم نے اس سے شکایت کی۔ میں بدلا تو نہیں پگلی۔ میں تو تنہائی سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ اعجاز کے آنے سے دل بڑھ گیا۔ پاکستان دیکھنے کو اب جی چاہنے لگا۔ اللہ کا شکر ہے۔ تم نے میرا نمبر فراز کو دے دیا۔ ایک رات بڑی اچھی گزری۔ اس کے ساتھ میں برمنگھم گیا۔ ساری رات ہنگامہ رہا۔ تم نے کچھ لکھا؟۔۔ سناؤ۔

میں نے کہاں کچھ لکھا۔ مزدوری کرنے جاتی ہوں۔ معاش کی فکر اب تک سوار ہے فل جوب ہے۔ پھر وہ ہنستے رہے۔ فراز کہہ رہا تھا یار! تم نے اپنا بھاؤ بڑھا دیا۔ آج کل کتنا بھاؤ ہے تمہارا؟..... جی.....

مشاعرے کا 'مشاعرہ کا' اور وہ کھلکھلے دار معصوم سی ہنسی سے ہنستے رہے۔ آپ اور شاعر مغرب جو خط و کتابت کر رہے ہیں۔ آپس میں ۔۔ جو بقول ان کے ہمارے مرنے کے بعد چھپے گی پھر دیکھنا۔ سنا ہے ان خطوط میں بھی ساقی ع

گالیاں دے کے بے مزہ نہ ہوا ۔۔۔ سلیم شاہد بے چارے کو بہت دیں آپ لوگوں نے۔ ٹی وی کا پروگرام اسی لئے کٹ گیا کہ چار گھنٹے جو شاعری کے لئے وقف تھے۔ اس میں سے آپ کے نئے دوست بے تحاشہ بی بی سی کی مفت شراب پیتے رہے کینٹین میں۔ سب انتظار کرتے رہے۔ آپ دونوں نے اتنی دیر لگا دی تھی۔ ظاہر ہے۔ آپ کے چہیتے دوست کے لئے پڑھنے کا وقت نہ رہا۔ آپ بولتے بھی اتنے آہستہ آہستہ تھے۔ کنڈکٹ آپ خود کر رہے تھے۔ یہ ولایت ہے۔ بی بی سی کا اسٹاف اپنے ٹائم سے ایک منٹ بھی زیادہ نہیں رکتا۔ سب بند کر کے چلے جاتے ہیں۔ کوئی بھی ریکارڈنگ نہیں کر سکتا۔ یہاں بڑے سے بڑے آدمی کے لئے کوئی نہیں رکتا یہ قانون ہے۔ ٹائم ہوتے ہی وہ پیک اپ کر دیتے ہیں۔ آپ دونوں اس بات پر خفا تھے کہ۔ آپ کا اور شاعر مغرب کا کلام نہیں پڑھوایا گیا۔ اور آپ کا سارا ٹولہ سلیم شاہد کو گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ کیا یہ بچوں جیسی

حرکت نہیں تھی۔

دیکھو نہ بھئی اب سلیم شاہد پروڈیوسر ہی تھا نا۔ میں اسٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ اسے کچھ سوچنا چاہئے تھا۔ وہ پروگرام اسسٹنٹ تھا۔ دل میں اسے میرا خیال کرنا چاہئے تھا۔

یہ راشد صاحب ہی تو تھے۔ اور جوش صاحب جنہوں نے بھائی صاحب سے سفارش کی تھی کہ لڑکیوں کو بھی کام کرنا چاہئے۔ اور جو مجھے ریڈیو لائے۔ میری اتنی مدد کی اور بھائی صاحب سے راشد صاحب ہی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صرف بچوں کے پروگرام میں آجائیں۔ اور میں نے پھر پر پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ اناؤنسمنٹ بھی کروں گی اور ضد کرنے لگی۔ اسکول کے بعد پانچ بجے سے آٹھ بجے تک۔ نو سے پہلے گھر آجاؤں گی۔ نہیں ہرگز نہیں بھائی صاحب (آفتاب قزلباش) ہمیشہ ہی منع کر دیتے۔ پہلے نعت پڑھنی شروع کی۔ پھر بچوں کا پروگرام۔ پھر فوجیوں کا پروگرام پھر عورتوں کا پروگرام۔ اب اناؤنسمنٹ کروں گی۔ راشد صاحب ہی تھے جو دوستوں کی طرح مجھ سے باتیں کرتے۔ مجھے اپنے قریب سمجھتے تھے۔ سبزی منڈی کے کوارٹروں میں جہاں قریب ہی کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک بھی رہتے تھے۔ سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی اتوار کو بچوں کے پروگرام کے بعد اکثر ہوتی۔ میراجی' ٹھاکر' مہرا' ورشا' وشوامتر عادل' کھوسلا' بھٹناگر' منٹو' کرشن چندر یہ سب ہوتے اور میں صرف تین آدمیوں کی خاطر چلی جاتی۔ تاکہ دوسرے روز اپنی کلاس میں شیخیاں بگھار سکوں۔ کہ کل ہی منٹو' کرشن چندر سے ملی تھی۔ گو کہ یہ لوگ مجھے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے ہوں گے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کو۔ وہ کیا وقعت دیتے۔ اتنے پڑھے لکھے لوگ۔ اور میں ایس ایس ٹھاکر کی دیوانی۔ گھنٹوں وشوامتر عادل سے ٹھاکر کے ڈراموں کی تعریفیں کرتی رہتی۔ اور جب وہ سامنے آتا تو ایک نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ پاتی۔ ادھر میراجی منہ میں گھونگنیاں ڈالے صحیح معنوں میں ہونٹ دبائے چپکے چپکے جب بھی انہیں وقت ملتا۔ مجھے گھورتے رہتے۔ ان میں بہت سے اسکرپٹ رائٹر۔ اناؤنسر' آرٹسٹ بھی تھے۔ جن کے نام یاد نہیں۔ پھر میں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ لوگ ساری ہی لڑکیوں' عورتوں کو گھورتے رہتے ہیں۔ چپکے سے۔ بے ضرر سے انسان ہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ دیکھنے دو۔

ایک دن راشد صاحب نے مجھے اور میراجی کو اسی کوریڈور میں پکڑ ہی لیا۔ دیکھو بی "بدلی" تم کیا لیکچر اس غریب پر جھاڑ رہی ہو۔ وہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ تم اور اس پر رعب ڈال رہی ہو۔ پھر ان کی بچوں جیسی ہنسی۔ کیا کہہ رہی تھیں۔ تین دیواریں گرا چکے ہیں۔ چوتھی بھی گر جائے گی۔

کیا بکواس کر رہی تھی۔ وہ بے تحاشا ہنستے رہے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ "آوے میراجی تو سی کوئی چنگی جئی چیز لکھ دیو" ایس کڑی دا فائدہ اٹھاؤ۔ "سونی جئی شے ہووے تے بندہ پاگل ہو جائے" ن۔ م۔ راشد کو پہلی دفعہ علم ہوا کہ میں پنجابی سمجھتی ہوں۔ کیونکہ میراجی کے لوہے جیسے جبڑوں میں سے پہلے دو لفظ نکلے۔ "اے سونی کڑی پنجابی دی سمجھ دی اے"۔۔

اور راشد صاحب کا منہ سرخ ہو گیا شرم سے۔۔ میں نے بھی ان کو طعنہ دیا۔ جائیے آپ کی مسز حسین آگئی ہوں گی۔ ان کا تلفظ ٹھیک کروائیں۔

آج ہو گئی بھئی ہم پر بھی ' وہ شرمندہ سے ہنستے ہوئے بھاگ گئے۔ میراجی نے میرے چہرے پر نفرت پڑھی تو ایک دم بولے بھئی۔ راشد صاحب حاسد ہیں اور کچھ نہیں۔۔ دل کا اچھا آدمی ہے۔ آپ نے تو اس کے نشتر لگا دیا آج۔ ہاں تو ہم کیا گفتگو کر رہے تھے۔ "سوچ انسان کا حق ہے" اور میں ان دونوں ٹھرکیوں کو چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی روم چلی گئی۔ یہ لفظ اعجاز ارضیاء کی ایجاد تھے۔ ریڈیو والوں کی زبان میں۔

"ٹھرکی" ۔ اور کئی سال بعد مجھے اس لفظ کے معنی معلوم ہوئے۔ تو طبیعت واقعی خوش ہو گئی۔ ہمارے ملک کے کتنے معصوم لوگ ایسے ہی تو ہیں۔

راشد صاحب نے متاثر ہو کر (اس واقعہ سے) ایک نظم لکھی تھی اور جب لندن کی پہلی ملاقات میں راشد صاحب نے مجھے اتنے برسوں کے بعد دیکھا تو انہوں نے فارسی میں کہا کہ تم ابھی تک خوش گل ہو۔ تو میں نے فارسی میں جواب دیا کہ تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میری فارسی پر نہال ہو گئے۔ "چشمائے شما خیلے خوب است"۔ وہ خوشی سے تڑپ گئے۔ مجھے گلے لگا لیا۔ اب وہ مجھے گلے بھی لگا لیتے تھے۔ ملتے ہی پیشانی بھی چوم لیتے تھے۔ مگر پہلے سر پر ہاتھ پھیرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ مجھ پر ایک نظم جو لکھی تھی عنوان تھا۔۔ "مجھے ایک نورس کلی نے یہ طعنہ دیا تھا"۔

مجھے ایک نورس کلی نے!
یہ طعنہ دیا تھا
تری عمر کا یہ تقاضا ہے
تو ایسے پھولوں کا بھونرا بنے
جن میں دو چار دن کی مہک رہ گئی ہو
یہ سچ ہے وہ تصویر '

جن کے سبھی رنگ دھندلا گئے ہوں
نئے رنگ اس میں بھرے کون لا کر
نئے رنگ لائے کہاں سے؟
ترے آسماں کا'
میں اک تازہ وارد ستارا سہی'
جانتا ہوں کہ' اس آسماں پر
بہت چاند' سورج' ستارے ابھر کر
جو اک بار ڈوبے تو ابھرے نہیں ہیں
فراموش گاری کے نیلے افق سے'
انہیں کی طرح میں بھی
ناتجربہ کار' انسان کی ہمت سے آگے بڑھا ہوں'
جو آگے بڑھا ہوں'
تو دل میں ہوس یہ نہیں ہے
کہ اب سے ہزاروں برس بعد کی داستانوں میں
زندہ ہو اک بار پھر نام میرا!
یہ شام دلاویز تو اک بہانہ ہے'
اک کوشش ناتواں ہے
شباب گریزاں کو جاتے ہوئے روکنے کی
وگرنہ ہے کافی مجھے اک پل کا سہارا'
ہوں اک تازہ وارد' مصیبت کا مارا
میں کرلوں گا درد تہ جام پی کر گزارا

راشد صاحب ہمیشہ لوگوں کے سامنے شیلا کے قصیدے پڑھتے رہتے۔ ساری عمر ایک محتاط سا پردہ اپنے اوپر چڑھائے رہے۔ ہمیشہ ایسا لگتا کہ جیسے آدھی بات کہہ رہے ہوں۔ اور آدھی بات چھپا رہے ہوں۔ اس میں فائدے بھی تھے۔ اپنی موت کا کرب بھی چھپا گئے۔ یہاں کے ایسے نئے

ادیب و شاعر اپنے ملک کے ادیبوں کے سامنے نیلی آنکھوں، سنہری بالوں والوں بیویوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر۔ اپنی شاداں زندگی گزارنے کا بہروپ پیش کرتے رہتے ہیں جیسے ان سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں۔ اوچھے بچوں کی طرح، دوسرے ملک میں جاکر۔ نئی نئی گاڑیوں، کھلونوں سے، کھیلتے ہیں اور دوسرے بچوں کو جلاتے ہیں کہ دیکھوں تمہارے پاس، ہمارے جیسے کھلونے نہیں۔ چیونگ گم چباتے ہیں۔ ایسے ہی ہمارے، بیویوں سے ڈرے ادیب جو نکاح کے وقت کہہ چکے ہوتے ہیں، بیوی آنکھیں کھولو۔ میں ہوں تمہارا اغلام۔ وہ جب لندن کے ادیبوں کے گھروں میں مہمان رہتے ہیں۔ تو وہ رات رات بھر نہیں سو سکتے۔ اور رشک و حسد اپنے اپنے لاگر اور وہسکی کے گلاسوں میں ملا کر چھپالیتے ہیں۔ ایسے ہی نشے میں راشد صاحب بھی ایک دن بہہ گئے آخر کار کوئلہ بھئی راکھ ہوئے۔ گو کہ وہ زبان سے نہ کہتے مگر بیوی کو ساتھ لاکر جب شعر سناتے اور کھانا کھاتے وقت کئی گھنٹے بولتے رہتے۔ وقار اور باقر کو ترجمہ کرنے پر لگادیتے۔ خود کئی گھنٹے بولتے رہتے۔ اور بھول جاتے کہ صاحب خانہ کی بہت سی فرنگن سہیلیوں کے پیچھے لمبی چوڑی فراک پہنے ایک اور خاتون بھی ان کے ساتھ آئی تھیں۔ جو ایک نرم سے صوفے پر وائن کا گلاس لئے بے خودی میں کہیں دور چلی گئیں۔ ان کو بھی ساتھ لے کر گھر جانا ہے۔ اور وہی اکیلے کمرے میں رات بھر ان کے ساتھ رہیں گی۔ یہ آہو چشم اسپین کی دوشیزائیں۔ اٹیلین آسٹریلین۔ نئے پود کی نئی نسل جو شعر کم سن رہی تھی اور ان کے گنجے سر پر وہسکی کی گرمی سے ابھرتے ہوئے ننھے قطرے دیکھ رہی تھی۔ اور قہقہوں میں ان کے رکتے رکتے جملوں کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی لمبے چوڑے باورچی خانے میں گرم پانی سے پلیٹیں دھوتی اور صاف کرتی اٹیلین مسز اکبر اور ان کی فرانسیسی ساتھی کپڑے سے پلیٹیں صاف کرتی جا رہی تھی۔ یہ سب کلرڈ شوہروں اور محبوبوں سے عاجز تھیں۔

کبھی کبھی اول جلوں عادتوں کے دکھڑے چپکے چپکے ایک دوسرے کو سناتی رہتی۔ اپنے اپنے میاؤں کا موازنہ کرتی رہتی۔ جب تک کہ شام ارغوانی ہو جاتی تو یہ مدھم شام کے انتظار میں اپنے اپنے ساغر لے کر اپنے شوہروں کے پہلوؤں میں آبیٹھتیں۔ کیونکہ یہ کام ان کے ملک کی جاہل عورتیں نہیں کرپاتی تھیں۔ ورنہ یہ لوگ ان سے شادی نہ کرتے جسم کی آسودگی ان کم نصیبوں کو کب حاصل ہوئی۔ گلاس لئے چپکے بیٹھے ادھر ادھر دیکھتے رہتے۔ راشد صاحب بے چین تھے۔

اس دن پھر مجھے وہ اداس زخمی لگے۔ حبیب بھائی نے کھڑے ہو کر اکبر حیدر آبادی کی تعریف

میں قصیدہ پڑھا۔ بھئی ہماری بھابھی بڑے آرام سے تیس پینتیس پراٹھے پکا لیتی ہیں۔ آج تو ہماری بھابھی نے کمال کر دیا۔ پچاس آدمیوں کا کھانا پکایا۔ راشد صاحب بھی بولے۔ اپنی بیوی کے گلاس میں ریڈ وائن ڈالتے ہوئے کہ بھئی ہماری بیوی نے تو ایک دو ایرانی ڈش سیکھی ہیں۔ اور میں نے فوراً جملہ دیا "کبھی کھلائیں" سب ہنس پڑے۔

لندن آ کر راشد صاحب پر تو بہار آ گئی تھی۔ آپریشن کے بعد بھی وہ آرام کرنے کے بہانے پندرہ بیس دن تک اسپتال میں رہے۔

"یہاں سے میں کچھ دن بعد ضیا محی الدین کے فلیٹ میں چلا جاؤں گا۔" وہ بتا رہے تھے۔

آپ اس کے فلیٹ میں رہیں گے۔؟ میرے تعجب پر وہ ہنستے رہے پگلی وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے۔ اپنا بچہ ہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو میں میں نے کام دیا تھا اس کو جب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت سے وہ احسان مانتا ہے۔ میرا۔ میری بیوی کا بڑا خیال کرتا ہے۔ بڑا "بی با" ہے۔ پھر اس کا فلیٹ "چلسی" کے پاس ہے۔ بیسوں 'ملنگوں کا تکیہ' کیوں ٹھیک ہے نا؟۔ فہمیدہ کی طرف "ٹھرکی" نظروں سے دیکھتے رہے۔

"ارے بھئی تم تو عورتوں کی جدید شاعری کی علمبردار ہو۔ نظمیں نہیں لائیں"۔ وہ ہنستی رہی۔

"تمہاری تعریف کر رہے ہیں" میں نے لقمہ دیا۔ اور فہمیدہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ جلدی سے بٹوے میں سے کاپی نکال لی۔ راشد صاحب کی عقابی چمک کو ایک نئی راہ نظر آئی۔

"سنو بھئی ایسے نہیں۔ تم کل شام کو آؤ۔ چار سے پہلے۔ میری بیوی نے میرے دوستوں کے لئے یہی وقت رکھا ہے۔ وہ بچے کو لے کر کل کہیں جا رہی ہے۔ تم کل آؤ۔ میں منتظر رہوں گا۔ ابھی ہم سب مل کر باتیں کرتے ہیں۔ اور میں ان کے چہرے پر ایسی کئی نیرنگیاں دیکھنے کی عادی تھی۔ وہ بھی سمجھ گئے۔ مجھے دیکھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

"یار فہمیدہ! یہ سحاب بڑی ڈاڈی ظالم تھی۔ اپنی سادگی و پرکاری میں بندے کو اڑا کر رکھ دیتی تھی۔ میں نے اس پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ اور میں نے فقرہ دیا۔ ان کا آپ تلفظ نہیں درست کرا سکتے۔ ان کا تلفظ تو آپ سے پہلے بہت سے لوگوں نے ٹھیک کروا دیا۔ راشد صاحب کھسیانی ہنسی ہنستے رہے۔ اور اس ڈر سے کہ میں قصہ نہ سنا دوں۔

ارے بھئی چائے منگواؤ۔ چھوڑو اس قصے کو۔

میں انہیں ڈرانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے کونے کونے میں یہ فقرہ استعمال ہو رہا تھا۔ تلفظ ٹھیک کرا رہے ہیں۔

۱۹۴۲ء کا ذکر تھا۔ جب کہ ان کا کمرہ دوپہر تین بجے سے شام کے پانچ بجے تک بند رہتا۔ راشد صاحب کا کمرہ، اسٹوڈیو کے پچھلے حصے کا کمرہ تھا۔ تین زرد مٹی میں ڈوبی سیڑھیاں۔ اس پر ہرے رنگ کا دروازہ چک کے اندر بند رہتا۔ ڈیوٹی روم سے کئی لوگ جاتے اور واپس آتے۔ کئی لوگوں کو ضروری کاغذات پہ دستخط کرانے ہوتے مگر جا نہیں سکتے تھے۔ واپس آجاتے۔ پھر جگہ جگہ مذاق اڑتا رہتا۔ سارے کونوں کھدروں میں ایک نئی اناؤنسر کی دھوم مچ گئی تھی جن کو ٹریننگ راشد صاحب دے رہے تھے۔ جن کی بڑی گاڑی مٹی میں بھری سیڑھیوں کے پاس چک کے قریب رکتی۔ جس میں سے سرخ و سفید ہنستی ہوئی ایک صاحبہ چنا ہوا دوپٹہ پہنے ہوئے اترتیں۔ چوڑیوں اور مہندی سے بھرے ہاتھوں سے غرارہ اٹھائے ہوئے۔ چک اٹھا کر تیزی سے اندر غائب ہو جاتیں۔ شام کو پانچ بجے وہی بڑی گاڑی دھواں اڑاتی آتی اور وہ شرم و حیا کی پوٹلی اس گاڑی میں چلی جاتی۔

کچھ "ٹھرکیے" تو ساڑھے چار بجے سے ہی "انڈر ہل روڈ" کے کونے کی پان والی دکان پر کھڑے ہو جاتے۔ نئی اناؤنسر کی ایک جھلک دیکھنے، جس کو ٹریننگ راشد صاحب دے رہے تھے۔ بڑی شے ہے۔ یہ ان کی دریافت ہے۔ مہرا ناؤنسر، شکیل، متھ۔ سب بڑے جل رہے تھے۔ آخر اتنے پرانے اناؤنسر ہیں ہم۔ یہ تو ہمارا حق ہے کہ ہم ٹریننگ دیں۔ راشد صاحب افسر ہیں تو کیا ہوا؟۔ بولنا کیا جانتے ہیں۔ آخر میں ایک دن غصے میں چلی گئی ان کے کمرے میں۔ وہ مجھے بیٹی بھی کہتے تھے کبھی کبھی۔ میں لوگوں کو برا نہیں کہنے دوں گی۔ آخر کیا وجہ ہے؟ اور میں دندناتی سیڑھیوں پر بھاگتی کمرے میں گھس گئی۔ اندھیرے کمرے میں میدہ شہاب چہرہ چمک رہا تھا۔ میز پر اسکرپٹ کھلے پڑے تھے۔ اور یہ ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔

"میں قسمت کا حال بتا رہا تھا انہیں" اندھیرے میں کچھ دیر بعد مجھے راشد صاحب کا چہرہ نظر آیا۔ میرا خیال تھا وہ خفا ضرور ہوں گے میری اس حرکت پر۔ مگر وہ ہنستے رہے۔ ارے تم شیرنی بنی قزلباشوں کا سارا خون چہرے پر مل آئی ہو۔ کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا تم کو۔ سحاب بی بی۔ اور ان کا پیار دیکھ کر میں پھر ریشہ ختمی ہو گئی۔ آپ کو لوگ بہت غلط سمجھتے ہیں۔ آخر راشد صاحب لوگوں کو آپ سے کچھ نہ کچھ تو پوچھنا ہوتا ہے تو وہ کیسے آپ کے پاس آئیں۔ دروازہ بند ہے۔ ڈیوٹی روم

میں لوگ مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ تو کچھ بھی نہیں کر رہے۔ صرف آپ ہاتھ دیکھ رہے ہیں۔
"مسز حسین" ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور ان کی ہنسی سے راشد صاحب بھی شگفتہ کھلے پھول کی طرح ڈال پر جھول رہے تھے۔ وہ حاسد راشد غائب تھا۔ جسے میراجی جانتے تھے۔ ایک معصوم سا انسان جو عینک کے پیچھے ذہن کی روشنی سے دیکھ رہا تھا۔ گلستاں سجائے شاعر بیٹھا تھا۔

"اور اب آپ دروازہ نہیں بند کر سکتے"۔ اور میں نے بڑا سا ٹوٹا ہوا پتھر پاؤں سے ہٹا دیا۔ اب جس کا جی چاہے وہ آ سکتا ہے۔

"نہیں سحاب بی بی بات دراصل یہ ہے کہ میں ان کا تلفظ ٹھیک کرواتا ہوں۔ لوگ گھڑی گھڑی آ کر تنگ کرتے ہیں۔ اس لئے ایک دو گھنٹے ان کو پڑھواتا ہوں۔" اور انہوں نے لفظ چبا چبا کر بولنا شروع کیا۔ اور بکھرے ہوئے اسکرپٹ ہاتھوں سے اکٹھے کرتے رہے۔ "آؤ چائے پیو۔ بی بی۔ مسز حسین نے مجھے بھی شامل کرنا چاہا۔ میراجی نے ایک روز ان کا جغرافیہ بتایا تھا کہ ان موصوفہ کے پاس سیٹھ جگت نرائن کی چیک بک بھی اور کار بھی ہے۔ اور ان کے پاس ان کے بچے۔ آیا اور شوہر، رہتے ہیں۔ چند منٹوں میں مجھے پتہ لگ گیا کہ اللہ نے ملاحت اور سادگی و پرکاری سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اور اوپر کی منزل بالکل خالی ہے۔ اتنی خالی کہ دروازے تک ان کی ہنسی میں چرچراتے سنائی دیتے ہیں۔ کیا راشد صاحب بہرے ہیں۔۔ کیا انہیں سنائی نہیں دیتا۔؟ اور پھر ایک دن ان کے قلم کو حرکت ہوئی اور پھر اس نظم "داشتہ" کی تخلیق ہوئی۔

میں ترے خندۂ بیباک سے پہچان گیا
کہ تری روح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے،
کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے، کوئی الم زہرہ گداز
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا!
آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی
کہ تری آنکھوں سے چپ چاپ برسنے لگے اشکوں کے سحاب،
اس پہ حیرت تو نہیں تھی، لیکن
کسی ویرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح
ایک مبہم سا خیال
دفعتاً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں

کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی
آج لیکن مری بانہوں کے سہارے کی تمنا ہے ضرور
یہ ترے گریہ غمناک سے میں جان گیا
تجھ سے وابستگی شوق بھی ہے'
ہو چلی سینے میں بیدار وہ دلسوزی بھی
مجھ سے مجبور ازل جس پہ ہیں مجبور ازل!
نفس خود بیں کی تسلی کے لئے
وہ سہارا بھی تجھے دینے پہ آمادہ ہوں
تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے
کوئی اندیشہ اگر ہے تو یہی
تیرے ان اشکوں میں اک لمحے کی نومیدی کا پرتو ہو کہیں
اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے
یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور بہانہ بن جائے!
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مرد لئیم
جسم کی مزد شبانہ دے کر
بن کے رازق تری تذلیل کئے جاتا ہے
میں بھی بانہوں کا سہارا دے کر۔۔
تیری آئندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں!

کئی دفعہ راشد صاحب کے گھر ہم سب نے سبزی منڈی کے کوارٹروں میں کھانا کھایا۔ بھابھی مسز راشد بچاری پر حسن تو کجا ملاحت تک کی چھینٹ بھی نہ تھی۔ ان کی دولت تو ڈھیر سے بچے اور نندیں تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کو کھانا پکا کر کھلاتی رہتیں اور ہنستی رہتیں۔ سنگھار کیا کرتیں ان کو آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ تو آئینہ حیراں کیا ہوتا۔ اس کے باوجود گھر با ہر بڑی محبوب تھیں اپنے کام کی وجہ سے اور راشد صاحب گھر میں بچوں کو سنبھالتے رہے مگر ترستے رہے۔ جب دیکھتے ہر بار کیوں پڑھا کرتے تھے۔ ایک لڑکی بگھارتی تھی دال۔

"ہاں بھئی سحاب۔ تم کو اتنی سی عمر میں فلسفہ حیات کس نے سمجھایا یہ تم میری سیدھی سادی بیوی کو کیا مینٹلی کرپٹ کر آئی ہو۔ وہ ایسے پوچھتے کہ میں ڈر جاتی۔ حسن و جمالیات رگ جاں کے ساتھ پیوست ہے۔ سب سن رہا تھا تمہارا لیکچر جو تم باورچی خانے میں کھڑی میری بیوی کو دے رہی تھیں۔ یار وہ روٹی پکائے گی۔ بچے سنبھالے گی کہ سنگھار کرے گی۔ کیوں میرا خرچہ کراتی ہو۔ اور کس کمبخت کو فرصت ملتی ہے کہ سنگھار دیکھے"۔ اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتے جاتے۔ وشوامتر عادل' میراجی' اوئے یارو! خدا کا خوف کرو۔ راجہ مہدی' یہ چھوٹی جئی کڑی۔ میری بیوی نوں ڈرا آئی گئی سی مکئی دی روٹی اور سروں دا ساگ کھان۔ اور فلسفہ جھاڑتی رہی (اوئے! کچھ کریئے ایدا) اور سب ہنستے رہے۔ قدوس' وشوا' مہرا' محی الدین' میراجی چپکے سے کتابیں دبائے کھسکتے ہوئے پکڑے جاتے۔ "میراجی کہاں چلے" اور وہ تحکمانہ لہجے میں پکارتے۔ بے چارے میراجی! مجھے میراجی پہ رحم آنے لگتا۔ اصل میں وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ مسز حسین کے بارے میں تو میں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں شاید ان کی بیوی کو سمجھا رہی ہوں۔ آخر مجھے بتانا پڑا کہ میں "سرلا" کرشن چندر کی بہن سے بحث کر رہی تھی۔ راشد صاحب کی بہن اور سرلا ایک طرف تھیں اور میں ایک طرف' عورتوں کو آزادی ملنی چاہئے۔ اور وہ کہہ رہی تھیں کہ میراجی جیسے سر پھرے انسان جن کا کوئی طریقہ زندگی ہی نہیں اور میں اردو شاعری کے علمبرداروں میں ڈھٹائی سے میراجی اور راشد صاحب کو برابر کھڑا کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ گندے رہتے ہیں۔ لکھتے رہتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کو پیسے ملتے ہیں۔ رتناولی کتنا بڑا منظوم ڈرامہ لکھا۔ کوئی لکھ تو لے' تب جا کر ان کو پیسے ملتے ہیں۔ راشد صاحب کی بہن اور "سرلا" دونوں ہی شور مچا رہی تھی۔ کیا فائدہ ان کی مدد کرنے سے وہ شام کو سارے شراب میں اڑا آتے ہیں۔ آپ لوگوں کے پاس ایک ایک کوارٹر ہے۔ ان کے پاس بستر تک نہیں۔ جہاں رات گزری وہیں سو گئے۔ اگر میں عورت نہ ہوتی تو ضرور اپنے گھر رکھ لیتی۔ ایسے ادیبوں کی مدد کرنی چاہئے۔ ٹھاکر کے اور ان کے تعلقات کو کوئی اور رنگ نہ دیں۔ ٹھاکر ایسا ادب نواز دوست ہے۔ اس کا اپنا رائل ہوٹل ہے۔ جس میں میراجی کی اکثر راتیں گزرتی ہیں۔ کھانا پینا مفت۔ اور اس آرٹسٹ نے ریڈیو اسٹیشن پر کچھ نہیں بتایا! اور آج تک زبان پر ان چیزوں کا تذکرہ نہیں لایا۔ کہ اس نے میراجی کی کیسے کیسے مدد کی۔ ایسے لوگ اب کہاں ہوں گے جو انسانوں کی قدر کرتے تھے۔ میراجی میری طرح ہر بات کہہ دیتے تھے۔۔ ان کے دل میں کوئی کپٹ نہیں تھا۔ جیسے ان کی

محبت کی داستان بچے بچے کی زبان پر تھی۔ بنگالی 'میرا' لڑکی کی کہانی 'میراجی کبھی مجھے بڑے اچھے دوست لگتے تھے اور راشد صاحب مردوں کے چور لگتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ وہ انسان جس پر عورت مرد کا لیبل نہ لگے ایسے لوگ بڑے بے ضرر ہوتے ہیں۔ مثلاً تمہارے میراجی۔ اور میں کہہ دیتی جب تک دونوں فریقوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہوا اپنے بارے میں۔ کبھی کبھی تو راشد صاحب میراجی پر آفس کے برآمدے میں ہی زور زور سے خفا ہونے لگتے۔ بدتمیزی کی حد تک۔ راشد صاحب میٹنگ میں خوب خوب رات کے پروگرام کی دھجیاں اڑاتے۔۔ قدوس 'داشوامتر عادل 'انصار ناصری صاحب 'میراجی کو کوئی بھی نہ بچاتا۔ ان کی نئی نئی نظموں کو راشد صاحب زور سے پڑھتے پھر ہنستے رہتے۔ کئی حصے کاٹ دیتے۔ رتناولی 'ڈرامے کے تو بہت سے حصے کاٹ دیتے۔ "یار میراجی کچھ پڑھیا کرو۔ اپنی ٹھیٹی دی کی ضرورت اے"۔ اور میں سوچا کرتی۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے کیسی نفرت کرتے ہیں۔ کیسے لفظوں کے نشتر لئے پھرتے ہیں۔ چاہے ریڈیو کے پروگرام ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔

زیب قریشی۔ ایتا۔ ورشا۔ کرشنا آہوجہ۔ باجی۔ خورشید۔ بہت سی جو مجھے یاد نہیں۔ لڑکیاں قراؤ نظر آتی ہیں۔ راشد صاحب کہا کرتے تھے جو اوئی اللہ کہہ کر ایسی ہٹتی ہیں مردوں کے سائے سے جیسے پگھل ہی جائیں گی۔ وہ سب مجھے دل میں چور لگتی ہیں۔ اور میں چپکے سے کہتی راشد صاحب بھی مردوں کے چور لگتے ہیں۔ اور اس دن لندن میں ٹیلیفون پر جب فہمیدہ نے مجھے بتایا۔ میں راشد صاحب سے ملنے کھانے پر نہیں جاؤں گی۔ وہ بھی مردوں جیسے ہیں۔ میرے بہت ضد کرنے پر اس نے ہچکولے لیتے ہوئے۔ ہنستے ہوئے بتایا سحاب سناتم نے۔ وہ اس آپریشن کے بعد لندن میں کسی ہوٹل میں مجھے لے جانا چاہتے تھے۔ وہ ہنستی رہی۔ گنجے کہیں کے۔ اور مجھے راشد صاحب واقعی زہر لگے۔ آج کل باہر رہ کر ایسی باتیں سن کر ٹال دی جاتی ہیں۔ اپنے ملک میں وہ اس طرح کہتے تو پٹ چکے ہوتے۔ میں چپ چاپ باقر کے ساتھ کار میں لندن سے آکسفورڈ اکبر کے گھر جاتے ہوئے۔ یہی سب کچھ سوچ رہی تھی۔ فہمیدہ یاد آرہی تھیں۔ ہماری بیچاری لڑکیاں!! کھیتوں کو' سرسبز باغوں کو' سرخ چھتوں والے ننھے چمکدار شیشے کے گھروں کو دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ نجمہ اور باقر سمجھے کہ میں کسی اور کرب میں ہوں جو چپ ہوں۔ بھئی شیلا بڑی اچھی بیوی ہیں راشد صاحب کی باقر نے باتیں کرنا شروع کر دیں اور میں دلی سے واپس لندن آگئی اسی کار میں بیٹھے بیٹھے۔ میں راشد صاحب کا زمانہ یاد کر رہی تھی۔ علی پور روڈ والے پرانے ریڈیو

اسٹیشن پر۔ جو میں باباکے ساتھ اور خواجہ حسن نظامی کے ساتھ جاتی تھی باباکی آخری تقریر تھی (ادبی صحبت) میں ضد کر کے اسٹوڈیو میں گئی تھی اور غلام علی صاحب نے کہا تھا۔ بی بی تم جب لال بتی آئے چپ رہنا۔ کھانسنا بھی نہیں۔ اس وقت قطب صاحب، غلام علی صاحب، اور راشد صاحب تینوں اندر اسٹوڈیو میں تھے۔ اس تقریر کے تین مہینے بعد باباکا انتقال ہو گیا۔ اور میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں کبھی ریڈیو پر جاؤں گی اور کام کروں گی۔ اس زمانے میں شریف زادیاں باہر کام نہیں کرتی تھیں۔ کجا کہ ریڈیو اسٹیشن پر۔

راشد صاحب کو اقتدار نے پہلے سے بہت مختلف کر دیا تھا۔ میں کتنی ذہنی منزلیں بدلتی رہی۔ حیدر آباد دکن کے مفتی کی بہن شبنم جن کے میاں حبیب حیدر آبادی ہیں۔ بڑا پڑھا لکھا گھرانہ ہے۔ اور اکبر حیدر آبادی جو آکسفورڈ میں رہتے ہیں۔ ان کے گھر دوپہر کا کھانا تھا اس روز۔ راشد صاحب بہت خوش تھے گھنٹوں اپنی نئی نظمیں سناتے رہے۔ حیدر آبادیوں کا شائستہ مہذب گروپ تھا۔ خواتین و حضرات گھنٹوں سنتے رہے۔۔۔ کھانے سے پہلے راشد صاحب اپنی نظمیں سناتے اور نہال ہوتے جاتے۔

پھر راشد صاحب کے انتقال کے کئی دن بعد شیلا کا ایک خط ملا اور انہوں نے فون کیا۔ خط کا مضمون بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ سمجھا بوجھا۔ نپے تلے جملے۔ تم کو مجھ سے خفا نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تم کو بہت چاہتے تھے۔ راشد تم سے فیسی نیٹ ہوتے تھے میں نے ان کی آخری خواہش پوری کر دی۔

میرے والد کے کری میشن کے وقت وہ دیکھنے نیچے گئے تھے کہ کیا Process ہے۔ انسان کس طرح جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ بقول "شیلا کے' ایسا کرناہائی جینک ہوتا ہے۔ نہ دباؤ نہ بہاؤ کچھ سیکنڈ کے بعد لاش بٹن دباؤ اور سر سے جلتی ہوئی بھاڑ میں گر جاتی ہے۔۔ پھر راکھ اک ننھے سے ڈبے میں مل جاتی۔ یہ جس پر نام اور پتہ لکھا ہوتا ہے۔

بقول شیلا' راشد صاحب اس حقیقت پر کئی روز سوچتے رہے تھے خاموشی سے۔

"زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے "اور میں سوچ رہی تھی میرے شاعر نے ان بڑے میاں کا جب یہ حشر دیکھا ہو گا تو جنت دوزخ دونوں رخ دیکھنے کے بعد نہ جانے کیا کیا شکوے اللہ میاں سے کئے ہوں گے۔ اس باغی شاعر نے سارے دکھ بھرے سالوں کا بدلہ انگریز بیوی سے لے لیا۔ بقول ایرانیوں کہ "زرنگی کی فرنگی بیوی کے ساتھ" شیلا کے اٹلی جانے کے ساتھ ہی موقع سے فائدہ

اٹھالیا۔

نذر محمد گجرات کا رہنے والا سیدھا سا شاعر جو اب بھی اپنے کھانوں کے لئے ترستا تھا۔ جو اپنے لوگوں کے لئے ترستا تھا۔ جو اپنی پہلی بیوی کے بچوں کو ابھی تک چاہتا تھا جو اپنی چھوٹی لڑکی کو پڑھانے کے لئے امریکہ کے ہر ٹیچر سے دوستی کرتا پھرتا۔ یہ وہی شیلا جو ان کی بیوی تھیں وہ ان کی چھوٹی بیٹی کی استانی تھی ایک زمانے میں راشد صاحب سے ایک لڑکا پیدا کر کے صحیح معنوں میں اس چھوٹی لڑکی کی ماں بھی بن گئی تھیں۔

شہریار راشد صاحب کا سب سے بڑا لڑکا سنا تھا اس روز لندن وقت سے پہلے پہنچ چکا تھا مگر وہ نہ ماں سے ملا نہ وہاں آیا جہاں یہ سب لوگ جمع تھے۔ ملن والی جگہ پر اگر بیٹا ہی آکر منع کر دیتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ راشد صاحب کو جلوا دیتے۔ یہ کیسا بیٹا تھا۔ جو اس لندن میں چھپا بیٹھا رہا جہاں باپ جلایا جا رہا تھا۔ کیسا خاموش احتجاج تھا۔ سنا تھا ساقی نے فاتحہ خوانی اپنے گھر میں کروائی لیکن بیٹا اس رسم میں بھی شامل نہ ہوا۔

ن۔م۔راشد شاعری اور ادب میں نئی راہ کا علم بردار' فارسی ادب پر مرنے والا راشد اور ان کے وہ احباب جو گاؤں اور قصبوں سے گوہر نایاب شہروں میں آکر علم و عمل سے نکھرے ادب کے ماتھے کے چاند بنے۔ ان میں سے اکثر اہل مغرب کے رسم و رواج کے دعوے دار بن گئے۔ ہمارے ادب کے انٹیلکچول کہلائے' جو کمروں میں بیٹھ کر تعزیتی جلسوں میں آج بھی کہتے ہیں۔ کیا ہوا مرنے کے بعد جسم کو چاہے جلا دو' چاہے بہا دو یا مٹی میں دبا دو۔ یہ کتابیں ہیں جو وہ چھوڑ گئے ہیں یہ ادب ہے جو وہ چھوڑ گئے ہیں۔ یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے اور یہی ہماری پہچان۔

ہماری نئی نسل جب کبھی ادب پر نظر ڈالے گی تو یہی کہا جائے گا۔ اردو شاعری کو بلینک ورس آزاد شاعری سے متعارف میراجی اور ن م راشد نے کروایا۔ ماورا' ایران میں اجنبی' لکھنے والا نئی راہ کا رہبر' یہ راشد ہی کی پہچان تھی۔

اور پھر کینیڈا کے مشاعرے میں اس رات مانٹی ریال کے جگمگاتے اسٹیج پر ایک لڑکی مری طرف اپنی بانہیں اٹھائے سوگوار آنکھوں سے مرا دل کھینچتے ہوئے لپک رہی تھی۔

کسی نے کہا مسز چوہدری آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

میرے دل نے سسکیاں سنیں اس کے گرم گرم ہونٹ مرے کانوں کو چھو رہے تھے۔ آپ نے بھی مرے اباجی کو جلوا دیا۔ وہ گلے میں بانہیں ڈالے رو رہی تھی۔ آپ سحاب آنٹی ہیں نا۔

یہ راشد صاحب کی محبت تھی۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی جس کے میں کچھ کام نہ آسکی۔ ان آنسوؤں سے کیا کام چلا جو ان کی بیٹی کی آنکھوں سے ابھی نکل رہے تھے اور جو میں اس روز گنوا چکی تھی۔ اتنا ہی کہہ سکی۔

بیٹی تم ایک ٹیلیفون ہی اگر شیلا کو کر دیتیں یا پاکستان امبیسی کو کہ میرے بابا کو نہ جلایا جائے۔۔ شہریار بھی آئے لیکن خاموش چھپے پھرتے رہے۔ شیلا تو تمہاری استانی تھیں تم تو انہیں ہم سب سے بہتر جانتی ہو۔ نہ جانے میں کیا کیے جا رہی تھی اس کی آواز ہلکی ہوتی گئی۔

آنٹی! ہماری کیا چلتی شیلا آنٹی کے سامنے۔ اتنی دور بیٹھ کر میں کیا کر سکتی تھی سوائے رونے کے اور ابھی ابا ہوتے تو کہتے تمہیں سوائے رونے کے اور آتا ہی کیا ہے۔؟ ہم دونوں ہنس پڑے۔ ہنستے ہوئے وہی کھنکے دار ہنسی جو راشد صاحب کی خصوصیت تھی۔ وہی ذہین آنکھیں جو بھابھی بیگم راشد نے چرا کر اپنی چھوٹی بیٹی کو بخش دی تھیں۔ میں اس کے آنسو پونچھ رہی تھی اور ان آنکھوں سے پیچھے وہی آواز میرا پیچھا کر رہی تھی۔ ان کی پسندیدہ نظم جو انکو بہت پسند تھی جیسے راشد صاحب پڑھ رہے ہوں۔ ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے۔

"ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے"

صبح کے سینے میں نیزے ٹوٹے،
اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے!
جسم کے ساحل آشفتہ پر اک عشق کا مارا ہوا
انسان ہے آسودہ، مرے دل میں، سر ریگ نہاں
میں فقط اس کا قصیدہ خواں ہوں
ریت پر لیٹے ہوئے شخص کا آواز بلند!
دور کی گندم وے، صندل و خس لایا ہے
تاک کی شاخ پر اک قافلہ زنبوروں کا!
تاک کی شاخ بھی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھی!
کیسے زنبور ہمیشہ سے تمنا کے خداؤں کے حضور

سر بسجدہ ہیں، مگر مشعل جاں لے کے ہر اک سمت رواں!
جو نہی دن نکلے گا اور شہر
جواں میوہ فروشوں کی پکاروں سے چھلک اٹھے گا،
میں بھی ہر سو ترے مژگان کے سفیروں کی طرح دوڑوں گا!
دن نکل آیا تو شبنم کی رسالت کی صفیں تہ ہوں گی
راستے دن کے سیہ جھوٹ سے لد جائیں گے
بھونکنا چھوڑ کے پھر کاٹنے لگ جائیں گے غم کے کتے
اور اس شہر کے دلشاد مسافر، جن پر
ان کے سایے سے بھی لرزہ طاری،
پیکر خواب کے مانند سر راہ پلٹ جائیں گے
رات یوں چاہا مجھے تو نے کہ میں فرد نہیں
بلکہ آزادی کے دیوانوں کا جمگھٹ ہوں میں
رات یوں چاہا تجھے میں نے کہ تو فرد نہ ہو
بلکہ آئندہ ستاروں کا ہجوم ---
صبح کے سینے میں نیزے ٹوٹے
اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے!

فیض صاحب، سحاب قزلباش، فہمیدہ ریاض، مسز موسوی اور سکندر مرحوم
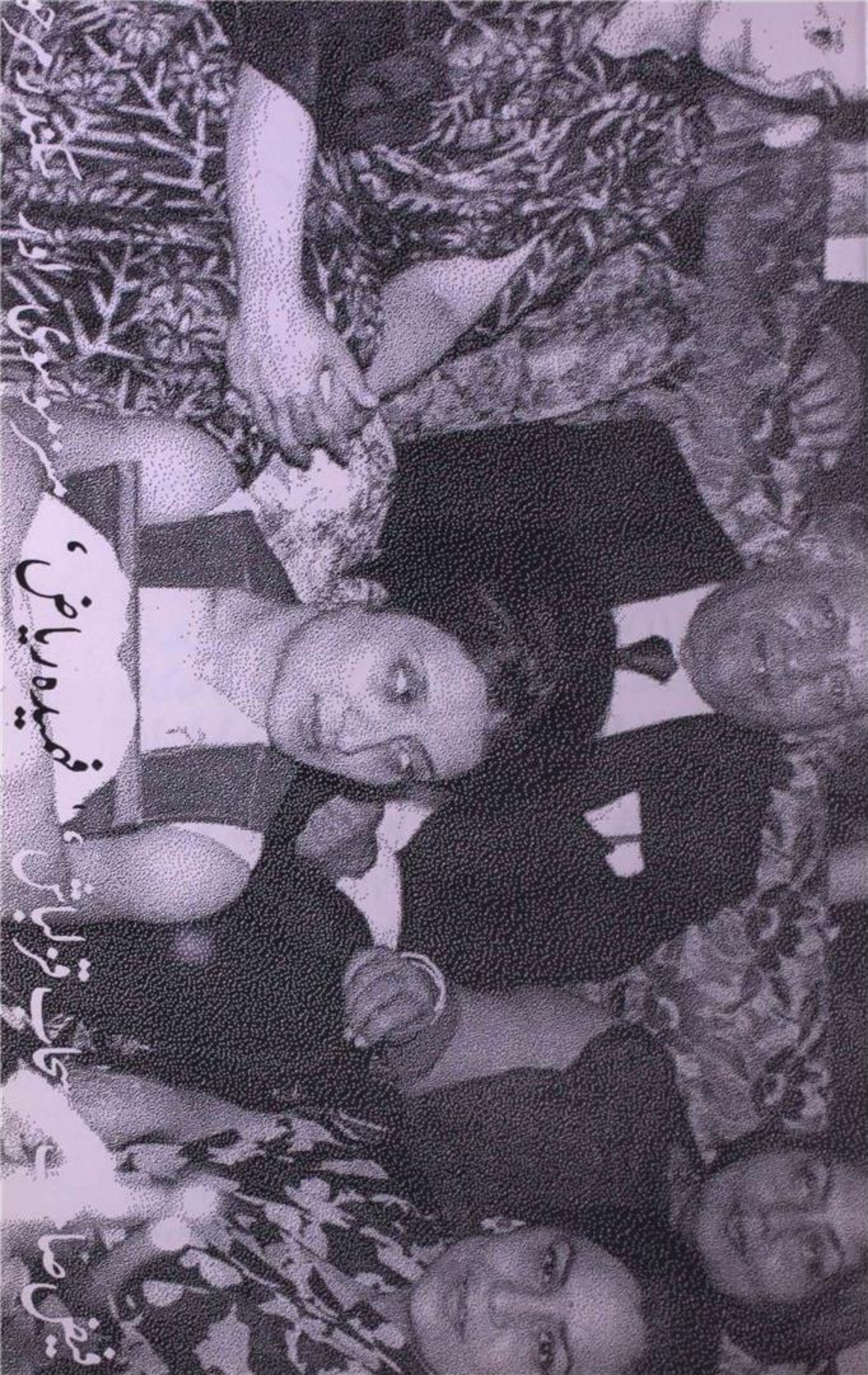
فیض صاحب

فیض صاحب راولپنڈی کیس (case) میں حیدر آباد جیل میں اسیر تھے۔ آمنہ بیگم مجید ملک اور ڈاکٹر شوکت صاحبہ ان سے ملنے جاتی رہتی تھیں۔ ۲۳ مئی ۵۴ء کو میں بھی حیدر آباد تک گئی مگر میرے نام کا اجازت نامہ نہ تھا۔ سوچا کہ اپنے محبوب شاعر کو جیل میں کس طرح دیکھ سکوں گی۔ اس لئے مجھے مجبوراً رکنا پڑا۔ واپسی پر ڈاکٹر صاحبہ اور آمنہ آپا کی اداس باتیں سنتی رہی۔ ان کی باتوں سے فیض صاحب کی مختلف تصویریں بناتی چلی گئی۔ فیض صاحب کی باغ و بہار شخصیت کے مختلف موڈ کے رنگ ان کے چہروں پر ابھرتے رہے۔ آمنہ آپا جب ملنے جیل میں جاتیں تو اخبار اور ان کی پسندیدہ سگریٹیں لے جاتی تھیں۔ واپسی پر فیض صاحب کی تازہ نظم یا غزل یا اشعار لے آتیں۔ اس دن فیض صاحب کا یہ شعر آمنہ آپا لکھ کر لائی تھیں جسے ہم گنگناتے رہے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے درد دل ہے
زبان سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکر وطن سے پہلے

دھول اڑاتی گاڑی تیزی سے کراچی کی طرف دوڑ رہی تھی۔ لیکن میں مسلسل اپنے خیالوں میں فیض صاحب کے کئی رنگ دیکھ رہی تھی۔ چمکدار خوبصورت چہرہ جس پر نکھرے نکھرے رنگ بکھر گئے تھے۔ تمتماتے رخسار، خوشی کے خزانے چھپائے ارغوانی ہوتے چلے جاتے۔ کبھی اداسی کی زردی میں چھپی ہو جاتے۔ اسی عالم میں میرے شاعر نے یہ اشعار کہے ہوں گے

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ رخسار کی پھوار پڑی
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے جو سلاسل تو ہم نے یہ جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساغر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے

(یہ امرتسر میں کہے گئے تھے ۱۹۳۶ء میں)

میں سوچنے لگی کہ ابھی جیل سے دو عورتیں آکر میرے پاس بیٹھی ہیں اور ہم تینوں اپنے محبوب شاعر کی رہائی کے لئے علیحدہ علیحدہ دعائیں مانگ رہی ہیں۔ جسے ہم سب کتنا چاہتے ہیں۔ آج جب فیض صاحب ہم سے روٹھ کر کہیں دور چلے گئے' مجھے آمنہ آپا کا خیال آرہا ہے، جو مجھ سے بھی زیادہ انہیں چاہتی ہیں۔ لیکن میں اس چاہت کا ذکر کس طرح کروں جو بیوی کے روپ میں ایک مخلص دوست کی چاہت ہے یا پھر ان دونوں خوبصورت بچیوں کی محبت جو انہیں اپنے پیار کرنے والے باپ سے ہے۔ وہ باہمت خاتون جو فیض صاحب کی بیوی ہیں' انہوں نے اس عتاب کے زمانے میں دکھ صبر سے سہے۔ وہ وفاشعار بیوی جو اس وقت باپ کی شفقت اور پیار بچیوں کو دیتی رہی اور ان کی تربیت اور پرورش سے بھی غافل نہ ہوئی۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ جب تمام جانے پہچانے چہروں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ ملنا تو درکنار زندگی کی معمولی ضرورتوں تک میں مدد کرنے

کی خواہش کے باوجود ڈر اور خوف سے لوگ راستہ کاٹ کر نکل جاتے اس زمانے میں کرنل مجید ملک اور آمنہ آپا کا گھر بے شک ان کے لئے کھلا ہوا تھا اور میں بھی فیض صاحب کی خیریت وہیں سے حاصل کرتی تھی۔ ایلس بھابھی کچھ دنوں کے لئے (Happy Home) میں جو آمنہ آپا کا گھر تھا، آکر ٹھہریں۔ میں نے خود دیکھا کہ منیزہ اور ہمی دونوں ایک ایک جوڑا دھو کر استری کر لیتی تھیں۔ ایلس بھابھی پاکستان ٹائمز میں باقاعدگی سے لکھتی تھیں۔ اور اس طرح بچوں کی تعلیم اور تمام خورد و نوش کا بندوبست برابر کرتی رہیں اور اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ یہ دونوں اب اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ خالص مشرقی انداز میں نہایت اعتدال سے زندگی گزار رہی ہیں۔ یہ کامیابی صرف ایلس بھابھی ہی کی محنت اور نگہداشت کا نتیجہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی زیب داستاں کا دخل نہیں۔ فیض صاحب کے بس کی بات بھلا کہاں تھی۔ بلکہ انہیں تو پوری پوری یکسوئی سے سوچنے اور بے فکری سے شاعری کرنے کا موقع بہم پہنچایا گیا۔۔۔ جب وہ جیل میں تھے۔ فیض صاحب مطمئن تھے کہ گھر کا کاروبار اطمینان بخش طریقے سے چل رہا ہے۔ اور یہاں رہ کر انہوں نے خوبصورت نظمیں کہیں۔ وہ جیل کی گھپ اندھیری کوٹھری میں بیٹھ کر نہ تو شکوہ بیداد کرتے، نہ اپنی مجبوریوں کا رونا روتے۔ وہ تو بس یہ کہتے:

شیرینیٔ لب، خوشبوئے دہن اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیٔ دل، تفریح نظر اب زیست کا درماں کوئی نہیں

جیل جانے سے پہلے کی صبح بہاراں اور شب نگاراں کی یاد انہیں تڑپاتی رہی۔ کبھی کبھی تو وہ ان صحبتوں کے لئے بے قرار ہو جاتے

درد آئے گا دبے پاؤں مسیحا بن کر؟
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہو گا
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا چلا جائے گا

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بجھ گئے ہیں
بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں
بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا حسن رنگ و نغمہ
وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہہ دام بجھ گئے ہیں

فیض صاحب بڑے نستعلیق اور شفیق انسان تھے۔ ان کے دل میں دردمندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دوستوں کے دوست تو تھے ہی لیکن دشمنوں سے دشمنی ان سے کبھی نہ ہو سکی۔ ایک مجموعے کے شروع میں عرفی شیرازی کا یہ شعر انہوں نے خود لکھا:

برو اے عقل و منہ منطق و حکمت پیشم
کہ مرا نسخہ غم ہائے فلاں در پیش است

اگرچہ وہ ہم نشینوں میں بیٹھ کر مسکراتے بھی تھے۔ باتوں کا مختصر جواب بھی دے دیا کرتے تھے، لیکن اکثر وہ کھو جاتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں سے خلا میں گھورتے رہتے، سگریٹ پیئے جاتے۔ ان کی روشن شفاف پیشانی چمکنے لگتی اور مجھے لگتا کہ ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

جب ۴۷ء کے ہنگاموں نے دلی کو لوٹ کر ویران کیا تو ہم لاہور پہنچ گئے۔ "دھنک پر ایک قدم" کی مصنفہ بیگم اختر ریاض الدین کے شوہر ریاض بھائی نے ماڈل ٹاؤن لاہور میں تین کمروں کی نیچے کی ایک منزل D-41 الاٹ کر دی تھی۔ میرے سب بھائی کراچی میں تھے۔ امی اکیلی لاہور میں تھیں۔ لاہور ریڈیو کے صدیقی صاحب نے الاٹمنٹ کے دفتر میں رسوخ پیدا کر کے شکایت کی کہ میں تین بچوں کا مہاجر باپ ہوں، ہندوستان میں حویلیاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ رہنے کو گھر تک نہیں ہے۔ سحاب کی شادی ہو گئی وہ کراچی میں ہیں۔ دونوں بیٹے بھی کراچی چلے گئے۔ اکیلی بوڑھی ماں ان کی وہاں رہتی ہیں۔ ان بڑی بی کے لئے تین کمروں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی

اپنے بیٹوں کے پاس جاسکتی ہیں۔ نوٹس انخلا کے لئے جاری کر دیا گیا۔ جبکہ بڑی بی (بیگم آغا شاعر) دلی میں "قیصر شاعر" چھوڑ کر صرف تن کے کپڑوں میں آئی تھیں۔ وہاں چمنستان کا دفتر جو علیحدہ تھا جس میں اثر جلیلی صاحب اور قریشی صاحب کام کرتے تھے۔ سرخوش بھائی کا کتابوں کا کاروبار الگ تھا۔ بیگم آغا شاعر، شاعروں اور ادیبوں اور گھر والوں کے طعام و رہائش کا انتظام خوش دلی سے اپنے بچوں کے ساتھ کرتی تھیں۔ لیکن ان بچاری کو جب نوٹس ملا تو گھبرا گئیں۔ انہوں نے فیض صاحب کو پاکستان ٹائمز کے دفتر میں فون کیا کہ آفتاب بھی کچھ دن کے لئے سرخوش کے پاس کراچی چلے گئے ہیں۔ بحالیات کے دفتر سے انخلا کا نوٹس بھیجا گیا ہے۔ کیا آپ ٹیلیفون سے رابطہ کر کے آفتاب کو بتا سکتے ہیں کہ وہ =/۲۰۰ روپے کا انتظام کر لیں۔

فیض صاحب نے بحالیات کمشنر کو ایک مراسلہ بھیجا اور اس خیال سے کہ ممکن ہے کرایہ نہ دیا جا رہا ہو، اپنے پاس سے =/۲۰۰ روپے کا چیک بھی لگا کر بھیج دیا۔ انہیں لکھا کہ آغا شاعر اردو کے مشہور و معروف ادیب اور شاعر تھے۔ ان کے خاندان کو اس طرح انخلا کا نوٹس دینا ہرگز مناسب نہیں ہے، ایسے خاندانوں کو تو یہاں آباد کرنا بحالیات کی ذمہ داری ہونی چاہئے۔ پھر امی کے پاس آکر انہیں اطمینان دلایا کہ امید ہے اب آپ کو پریشانی نہ ہو گی۔ لیکن اگر کسی وقت اس کا امکان ہو تو آپ فون کر دیجئے گا۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔ آپ میرے ہاں آجائیں اور وہاں اطمینان سے قیام کیجئے۔

مجھ سے بڑے بھائی آغا اقبال پنڈی میں تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ اخبار میں پڑھ کر فیض صاحب ان کے پانچ منزلہ مکان پر پہنچے۔ اتفاق سے نیچے ہی آفتاب بھائی مل گئے۔ فیض صاحب کہنے لگے میں اوپر جاؤں گا۔ اگر امی نہ ہوتیں تو پھر نہ جاتا۔ بھائی نے کہا، آپ اتنی اونچی جگہ نہ چڑھئے۔ مگر وہ نہ مانے۔ آفتاب بھائی کا ہاتھ پکڑے ہوئے سیدھے پانچویں منزل پر پہنچے۔ امی کے پاس چپکے بیٹھے رہے۔ امی نے کہا فیض صاحب! میں اس بڑھاپے میں لٹ گئی۔ فیض صاحب کھڑے ہو گئے اور امی کو سہارا دے کر دوسرے کمرے تک لائے اور صرف اتنا بولے! "آپ پر شدید ابتلا ہے اس وقت اپنے کو سنبھالئے۔" بڑی دیر تک چپکے بیٹھے رہے۔ سگریٹ پینا بھی بھول گئے۔ اس نئے زمانے میں وہ جدید شاعر کتنی پرانی تہذیب کا پابند تھا۔ دکھی دلوں کے رشتوں کو کیسے نبھاتا تھا وہ شخص۔ مجاز، جذبی، سردار جعفری اور سبط حسن تو ان کے ہم عمر تھے ہی لیکن ترقی پسندوں کے گروپ کے جوش ملیح آبادی ان سے عمر میں بڑے تھے۔ فیض صاحب بھی ان کا احترام کرتے

تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان سے پاکستان آجانے کے بعد جوش صاحب کے آخری دن سخت کرب اور تکلیف میں گزرے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں فراز اور فیض صاحب شریک تھے۔ فیض صاحب نے حق دوستی ادا کر کے آخری منزل تک جوش صاحب کا ساتھ دیا۔

کیا کیا یادیں تصویریں جگمگائیں اور فیض صاحب کا تبسم بھرا چہرہ ابھر آیا جو کبھی نظر نہیں آئے گا۔ ایک بار ہم سے مشاعروں کے سیزن میں لاہور سے سیالکوٹ جا رہے تھے، فیض صاحب کے شہر۔ فیض صاحب بڑے پریشان تھے۔ جوں جوں سیالکوٹ قریب آتا جاتا کبھی چہرہ سفید ہو جاتا کبھی سرخ قرمزی۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو ہو جاتے۔ وہ بار بار اپنے رومال سے اپنا چہرہ پونچھ رہے تھے، نہ جانے میں نے کیوں بے اختیار ہو کر کہا۔ فیض صاحب آپ یہ رومال مجھے دے دیجئے اور اس پر ایک شعر بھی میرے لئے لکھ دیں۔ پہلے تو مسکرائے پھر حیرت سے آنکھیں کھولے مجھے دیکھتے رہے۔ اور مجھے پتہ لگ گیا کہ جیسے کہہ رہے ہوں۔ رومال بھی کوئی چیز ہے۔ کچھ اور مانگا ہوتا۔ میں اور شوکت تھانوی زور سے ہنس پڑے۔ ایک دم ساتھ بیٹھے ہوئے صوفی تبسم نے اپنی ٹھیٹھ پنجابی زبان میں کہا "نی کڑیئے توتے رومال منگ دی ایں تو کہہ سئی اسی تے اپنا دل کڈھ دینے آں"۔

فیض صاحب نے کہا کہ "صوفی صاحب میں یہی خوبی ہے۔ کتنی جگہ بچا لیتے ہیں"۔ میں نے فیض صاحب سے کہا "فیض صاحب جب میں آپ پر مضمون لکھوں گی تو یہ شعر سب سے پہلے ہوگا۔ فیض صاحب زور سے ہنسے! ارے بھئی خبردار۔ میں کوئی میراجی ہوں"۔ میں نے میراجی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے"۔ جب وہ مضمون چھپا تو اس وقت فیض صاحب جیل میں تھے۔ انہوں نے پڑھا اور سرخوش بھائی کو لکھا۔ سحاب کو مبارک باد دیجئے۔ ایسا مضمون لکھوانے کے لئے میراجی یا میراجی کی موت دونوں کام مشکل ہیں۔ یہ اس مضمون کی طرف اشارہ تھا۔ چونکہ میراجی کو سب ہی جانتے تھے۔ میراجی پر باتیں ہوتی رہیں۔ اور سیالکوٹ قریب آگیا۔ شام ہو چلی تھی۔ سڑکوں پر اکا دکا بتیاں جلنی شروع ہو گئی تھیں، مجھے تو چھوٹا سا ننھا منا گاؤں قصبہ سا لگا۔ اور ادھر فیض صاحب کے چہرے پہ پوری بہار اتر آئی تھی۔ آنکھیں بھی روشن تھیں۔ جیسے ذہن کے پیچھے آتش بازیاں چھوٹ رہی تھیں اور جیسے ان کی ساری روشنیاں آنکھوں میں ٹھہر گئی ہوں اور میں انہیں دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ یہ ان کا شہر ہے۔ ان کی زندگی کی پہلی محبوبہ کا

شہر، ہم سب کے ساتھ ہوتے ہوئے یہ شخص کتنا تنہا ہے۔ اور ہمارے ساتھ نہیں۔ ان گلیوں سڑکوں پہ کب کا بھاگتا پھر رہا ہے۔ ہماری آوازیں اور قہقہے کتنے دور ہو گئے ہیں اس سے۔ ایسا ہی ایک رخ دلی میں ان کے چہرے پہ نظر آیا تھا۔

جب ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کے مکان پر سلونی شام راجپور روڈ پر آئی۔ گرمیوں کی شام موتیا، موگرے کے پھولوں سے مہلک رہی تھی۔ باہر لان پر زہرہ آپا (بیگم شوکت اللہ انصاری) کے ساتھ ہم مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت کم عمر تھی۔ میری عمر کی لڑکیاں اس زمانے میں فیض، ساحر، مجاز، جذبی کی شاعری پر فریفتہ تھیں (اور میں بھی تو ان میں سے تھی، میں کیوں اس محفل میں بلائی جاتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کبھی زہرہ آپا، کبھی حمیدہ سلطانہ اور آمنہ کار میں لے جاتیں کہ فیض صاحب چائے پر آ رہے ہیں۔ تم بھی چلو۔ اور لان پر غرارہ پہنے، چنا ہوا دوپٹہ اوڑھے پھولوں کی بالیاں پہنے زہرہ آپا مسکرا رہی ہوتیں۔ اس زمانے میں مجاز زہرہ آپا کے میدہ شہابی رنگ پر نثار تھے اور انہی دنوں ان چمپئی چنے ہوئے دوپٹے کے آنچل کو پرچم بنا لینے کے راگ الاپ رہے تھے۔ اکثر ان کی محفلوں میں زہرہ آپا کی حسین سہیلیاں راجن نہرو سپرد خاندان اور سکندھ خاندان کی خوبصورت چہروں کی لڑکیاں موجود ہوتیں جو سب فیض صاحب پہ نثار تھیں۔ اور وہیں پہلی دفعہ میں نے ڈاکٹر رشید جہاں کو دیکھا۔ تو یہ ہیں وہ جن پر سارا زمانہ مرتا ہے۔ یہ ہیں کامریڈ ڈاکٹر رشید جہاں۔ اب یاد آتا ہے۔ جیسے اقبال اور شبلی کے زمانے کی عطیہ فیضی اور یہ فیض صاحب اور ان کے ہم عصروں کی کامریڈ ڈاکٹر رشید جہاں۔ میرے بابا اور جوش صاحب اور فراق کے زمانے کی بلبل ہندوستان سروجنی نائیڈو۔ یہ ساری ایسی پڑھی لکھی عورتیں تھیں جن سے آسانی سے یہ پڑھے لکھے انٹیلیکچول مرد حضرات کیمونیکیشن آسانی سے کر سکتے تھے۔ پھر اگر محترمہ خوبصورت بھی ہوں تو ڈاکٹر رشید جہاں، عطیہ فیضی درشہوار، امرتا شیر گل، عطیہ حبیب اللہ اور بیگم میاں افتخار الدین کے نام لئے جاتے۔

ویسے فیض صاحب ایسے خوش بخت انسان تھے کہ انہیں سب بے حد پیار کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ملک میں اور ملک سے باہر اپنی شہرت کی معراج خود دیکھی۔ جب ان کی شہرت چپہ چپہ پر پہنچی اور جس سے ان کے وطن کا نام روشن ہوا۔ اور وہ دیکھتی تھی کہ اپنے نیازمندوں اور اپنے چاہنے والوں میں بیٹھ کر فیض صاحب بے حد خوش ہوتے تھے۔ ایسی صحبتوں میں ہمیشہ ان کے گرد عورتوں مردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لندن ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ برمنگھم میں ان کی سالگرہ کا اہتمام ہو

رہا تھا۔ لوگ اپنے محبوب شاعر کی سالگرہ منانا چاہ رہے تھے۔ اس شام لندن کی بھیگی بھیگی سی رات میں، جب بی بی سی سے تھکی ہوئی گھر پہنچی تو فون پر فیض صاحب تھے۔ ارے بھئی سحاب کیا کر رہی ہو۔ وہ اپنے اسی تھکے ہوئے انداز میں بول رہے تھے۔ کب آئے آپ فیض صاحب؟۔ سنو بھئی! تم ایسا کرو۔ ابھی ٹرین بوسٹن سے پکڑو اور فوراً برمنگھم چلی آؤ۔ بدریا سلیم شاہد تمہیں اسٹیشن سے لے آئیں گے۔ ایک جشن ہو رہا ہے یہاں۔ "تو میں نے کہا کہ سحاب کو بھی بلاؤ"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا! آپ تو اللہ میاں کے پاس سے دن رات کے جشن لکھوا کے لائے ہیں۔ میں ابھی ابھی بی بی سی سے گھر پہنچی ہوں۔ اتنی دور بوسٹن کیسے پہنچوں۔ اگر میں غریب مرکھپ کے پہنچی تو آپ کی شکل زیبا تو دیکھنے کو ضرور ملے گی۔ مگر جناب یہ تیس (۳۰) پونڈ کا نسخہ بڑا مہنگا ہے۔ ارے بھئی چلی آؤ۔ پیسے تو ہم دیں گے۔ وہ ایسے ہی تھکے سے ہنستے رہے اور یہ نہیں بتایا کہ سالگرہ خود ان کی منائی جا رہی ہے۔

لندن ہی ایسا شہر ہے جہاں ہر طرف سے احباب آتے ہیں۔ ان سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اور پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اکثر میرے گھر پر بنے بھائی (سجاد ظہیر) ہائے کیا لاجواب انسان تھے، امریتا پریتم، عصمت آپا، پدماسچ دیو، سردار جعفری بیٹھے ہیں اور ان میں فیض صاحب بھی موجود ہیں ہرچند کہیں نہیں وہ گم سم ہو جاتے۔ ان کا بلند آواز سے قہقہہ کبھی نہیں سنا گیا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ ضرور کھیلتی رہتی تھی۔ کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں کے بادل چھا جاتے تھے اور کانچ کے گلاس سے ابھرتی ہوئی رقص کرتی ہوئی آنکھیں جن میں فکر موجزن دکھائی دیتی تھی۔ ایک شعور شغب، شعر و نغمہ اس بے خبری میں رات گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کئی مرتبہ فیض صاحب کو پہنچانے خالد حسن اور علوی بھائی کی گاڑیوں میں میں بھی رات تین بجے بھی گئی ہوں۔ Hill Muzwell چھوڑنے

انہیں کے فیض سے بازار عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے ہیں

فیض صاحب کا یہ انداز بھی خوب تھا جس کا کیا ٹھکانا۔ میرے ہی گھر میں وہ فہمیدہ ریاض، نیرا، سریندر کوچر، پدماسچ دیو اور سرجیت، میری دوستوں سے ملے اور ایسی شگفتگی سے ملے، جیسے ان سے برسوں سے رفاقت تھی۔ فہمیدہ سے بھی میرے گھر پر ملتے رہے۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ

"داغ اپنی جمائے جاتا ہے"۔ اپنے شعر سناتی رہی۔ اور فیض کی نرمی اور اخلاق سے اسے یقین آ تا گیا کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ ولی دکنی سے لے کر فراق تک تمام شعرا کے متعلق وہ اپنی رائے دیتی رہی اور فیض صاحب اس کی رائے سے اتفاق کرتے چلے گئے۔ مسکراتے رہے۔ "ہم سگریٹ وہم پیالہ وہم نوالہ" رہے۔ دن دن بھر نشستیں ہوتی رہیں۔ اور فہمیدہ۔۔۔ تو جیسے دیوانی ہو گئی تھی۔

وہ روس جانا چاہتی تھی۔ فہمیدہ نے یہ بھی باتوں باتوں میں بتایا تھا' روس جانے کی اسے حسرت ہے اور پیار بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہی کہ "آپ مجھے رشیا بھجوا دیجئے گا فیض صاحب" اور وہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ "ضرور ضرور یہ کون سا مشکل کام ہے"۔ پھر ایک دن جب میں کھانا لگا رہی تھی تو فیض صاحب اسٹالن لینن کی شمع روشن کئے بیٹھے تھے۔ پلیٹ میں ایک آدھ روٹی کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ وہ ان کی نظموں کے ٹرانسلیشن سنا رہے تھے۔ جب بھی میں کچھ نہ کچھ رکھنے آتی' میز پر فہمیدہ کی پلیٹیں صاف ہو چکی ہوتیں۔ انگلیاں چاٹ رہی ہوتی تھیں۔ چٹخارے لے رہی ہوتی تھی۔ فیض صاحب کا کئی گھنٹوں کی تھکن سے چہرہ بوجھل ہو گیا تھا۔ جیسے ہی فہمیدہ ان سے پیسے لے کر سگریٹ لینے گئی تو میں نے بتایا کہ کھانا بھی کھا لیجئے اور ان صاحب زادی کی عمر ان ڈاکٹرنی صاحبہ سے بہت کم ہے چونکہ رنگ اور چہرے کی بناوٹ ایک ہے' آپ بے خبری میں پھر سے رنگ نقش ملا رہے ہیں ان ڈاکٹرنی صاحبہ کے۔ حفیظ ہشیار پوری کا ایک شعر سن لیں۔ "پگلی جو سگریٹ لینے گئی ہیں۔ وہ اپنی جگہ خوش ہیں کہ آپ بھی اس کی ذہانت کا لوہا مان گئے"۔ "ذہین تو ہے وہ۔ تم نے کھانے میں کیا چیز جلا ڈالی آج" اور میں اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ "جی نہیں۔ میں بڑی ڈھیٹ ہوں۔ اس تک آنچ نہیں پہنچے گی"۔ "اچھا اچھا شعر سناؤ حفیظ کا کیا سنا رہی تھیں"۔ اور وہ آنکھیں بند کئے میری لگائی ضرب کو سہہ رہے تھے۔ ایسا ہی ہوتا ہے ورنہ آدمی اندھا ہو جائے' فیض صاحب تھکے تھکے بول رہے تھے۔ "تاب ہے سنئے"

اب تو پہلی ہی ملاقات میں ہر صورت پر
کسی دیکھی ہوئی صورت کا گماں ہوتا ہے

"ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ تم کو کس نے عورت بنایا۔ پرانی باتیں ہر بار نہیں دہراتے۔ آپ سگریٹ اور نہیں پیئیں گے اور شراب بھی نہیں۔ جلدی سے کھانا کھا لیجئے۔ فیض صاحب مجھے یقین ہے وہ

سیالکوٹن جو تھی نا۔ اور وہ آپ کی مسیحا۔ اور وہ بمبئی کی پنڈتانی اور یہ چھوٹی خاتون جو سگریٹ لینے گئی ہیں ساری چھوٹی بڑی خواتین میدہ شہابی رنگت اور تیکھے نقشوں والی ہیں۔ اس لئے آپ کو اچھی لگتی ہیں۔"

"نہیں بھئی ہر عورت اچھی ہوتی ہے۔ تم تو بیہودہ ہو۔ تم کوئی عورت تھوڑی ہو۔ اس لئے اچھی نہیں لگتی۔"

پھر لاہور میں کئی سالوں کے بعد جب میں نے اشفاق اور بانو قدسیہ سے کہا۔ کہ کل میں جا رہی ہوں لندن۔ لاہور کے ادیبوں کو ملا دو۔ چائے پر۔ اور فیض صاحب کو ضرور بلاؤ۔ بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔

"فیض صاحب کو تم خود کہو۔ باقی میں سب کو بلاؤں گی۔ پھر دوسرے دن روزہ کھلنے کے وقت نور جہاں پیاری نے مجھے اپنی گاڑی میں بانو قدسیہ کے گھر چھوڑا۔ اس کا بھی بہت دل چاہ رہا تھا کہ جائے فیض صاحب کو دیکھنے مگر اس کی ریکارڈنگ تھی (آنکھیں بند کر کے) وہ بھی کیسے فیض صاحب کو مسکرا کر یاد کر رہی تھی۔ فریدہ خانم کیسی پیار اور محبت سے فیض صاحب کی چاہت کی باتیں کرتی۔ یہ کیسے آپ محبوب تھے سب کے۔ ساری عورتیں کیسے آنکھ بند کر کے آپ کو پیار سے یاد کرتیں۔ ایک دوسرے کے سامنے کوئی کسی سے نہیں جلتا تھا اور آپ سب کے محبوب تھے۔ اور اس دن پارٹی میں 'میں نے پوچھ ہی لیا۔ سادگی سے پیاری سی بانو قدسیہ کبھی مجھے 'کبھی فیض صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ "کی گل اے فیض صاحب۔ ہن بیگم اقبال دا کی بنے گا" ایک دبلی سی خاتون جو کچھ دیر پہلے فیض صاحب کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں۔ قدسیہ کا اشارہ ان کی طرف تھا۔

"ہائے فیض صاحب وطن آکر یہ حالت ہو گئی آپ کی" میں سمجھ گئی اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اور میرے ساتھ اعجاز' قدسیہ اور سب ہنس پڑے اور میں ان کو روٹھے دیکھ کر لپٹ گئی۔ ایسے پیارے ہیں آپ۔ آپ کو کتنا لوگ چاہتے ہیں۔ بیروت میں قحط ہو گا۔ لاہور تو حسین چہروں سے بھرا ہے۔

اب ایسا بھی کیا۔ اس روز لندن میں بمبئی سے پدماچ دیو ایک خوبصورت گلدان لائی تھی۔ ایسے ہی پیار سے کہہ رہی تھی۔ یہ تجھ کو نہیں دے رہی۔ سحاب صرف فیض صاحب کے لئے ہے۔ ان کو سرخ گلاب ڈال کر دینا۔ یہ میرے کشمیر کا تحفہ ہے۔ جب خرید رہی تھی تو فیض صاحب یاد آئے۔

"جملہ درست کیجئے بی بی۔ ہمارا کشمیر۔ اور گلاب ڈال کر نہیں کہتے"۔ "جی نہیں کشمیر بھی ہمارا ہے۔ فیض صاحب بھی ہمارے ہیں۔ اور پھول دان میں گلاب ڈالتے ہیں" اور فیض صاحب بولے۔ "تمام عمر ہماری اسی میں گزر گئی۔ جو تمہارا ہے وہ ہمارا ہے۔ ہر خوبصورت عورت ہماری۔ باقی ہر شے تمہاری"۔ یہ سن کر بدما سرخ ہو گئی۔ شرما گئی۔

ایسا محبوب شاعر جسے اتنے ملکوں شہروں میں' اس بھری دنیا میں کوئی ایسا ہے جو کہہ دے فیض صاحب نے مجھے برا کہا' مجھ سے خفا تھے' میرے لئے خرابی کی' یہ پیغمبروں جیسی صفات کا شاعر۔ اب نہ پیدا ہو گا۔ اور نہ اب ایسی مائیں پیدا ہوں گی۔ جو ایسے قابل' ذہین' ادیب' شاعر' عالم پیدا کریں گی۔ ان عظیم ماؤں کے میں قربان جو ایسی تربیت دیتی تھیں اپنی اولادوں کو۔ اور آج یہ سوچ کر ایسے عظیم انسان پرکھنے کے لئے کیا رہ گیا۔ بہت سے مغرور انسانوں کو میں نے معاف کر دیا۔ خدا غرور کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنے بہت سے پرانے ایسے چہروں کو پھر سے دیکھ لیا۔ جو بہت مغرور ہو گئے ہیں اور جو فیض صاحب کے پیچھے انہیں برا کہتے تھے اور سامنے خاموش رہتے تھے

ہم خستہ تنوں سے محتسبو! کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشت خاک جگر ساغر میں ہے خون حسرت مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا' لو جام الٹائے دیتے ہیں

صبح سے یہ اشعار میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے۔ یہ عجیب چاہت ہے۔ اس چاہت کو جو بھی نام دے لیں۔ نہ روتے ہی بن پڑتا ہے۔ نہ اس آواز کو بند کر پائی ہوں جو کل سے میرے کلیجے کو نوچ رہی ہے۔ فیض صاحب کو اب تم کبھی نہیں دیکھ پاؤ گی۔ اس لندن میں جب سے یہ خاموش جال بچھانے والے آئے ہیں۔ اپنے سنہری جالوں میں سیاست کے لیبل چھپا کر۔ کلچرل کے کتبے جگہ جگہ لگائے ہیں۔ مختلف ناموں سے میرے فیض صاحب کو بھی انہوں نے ملوث کر دیا۔ ان کو بھی ایئرپورٹ سے جلسہ گاہوں میں لے جاتے اور اپنے گھروں میں چھپا کر رکھتے رہے کہ ہر ایک سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اتنے سالوں کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ فیض صاحب لندن میں رہیں اور میں ان سے بات نہ کر سکوں۔ وہ کچھ ایسے آرام کے رسیا تھے کہ جہاں بھی شام آرام و آسائش سے گزر جائے' وہ وہیں رہ جاتے اور اسی آرام و آسائش کی خاطر وہ برمنگھم میں بدر صاحب کے گھر میں

رہتے رہے۔ ان کے گھر میں فیض صاحب اور ان کے چاہنے والوں کے لئے بھی دلداریاں اور محبتیں عام تھیں۔ لندن میں اب کے عرب بینک کے ایڈوائزر ماجد کے گھر رہے۔ اس دفعہ اس سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ بی بی سی سے معلوم ہو جاتا۔ کل وقار ان کی ریکارڈنگ کرلائے۔ پرسوں برمنگھم میں فراز' زہرہ' ماجد' عارف کے ساتھ ریکارڈنگ کرنے گئے ہیں۔ پھر وہ آخری انٹرویو بی بی سی پر کل دیکھا۔ جو گاڑی لایا وہ لے گیا۔ سلیم شاہد جب تھے تو مجھے ضرور بلواتے تھے۔ اب ٹی وی پر نئے لوگ آگئے۔ جس نے ان کی تعریف کی خوش ہو گئے اور انہیں بلالیا۔ سلیم شاہد دلی سے ریڈیو اسٹیشن سے فیض صاحب کو جانتے تھے۔ اب اتنی عمر گزارنے کے بعد ٹیلیفون کرتی پھروں کہ فلاں صاحب مجھے بلالیں۔ یا میں فیض صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔ اپنے بس کی بات کہاں۔ نہ اس عمر میں یہ زیب دیتا ہے۔ نہ مجھے ان سے ضروری کام کروانے تھے۔ میں شکل دیکھ کر ٹھہر جاتی۔ وہ خود آتے۔ خود ٹیلیفون کرتے جب میں پاکستان ایمبیسی میں کام کرتی تھی تو ہر شام کو خالد حسین کے پاس فیض صاحب اپنے پیغام چھوڑ جاتے۔ "نوکری کے بعد فلاں کلب یا فلاں پب میں آجاؤ" وہ منتظر ہوتے۔

ایک بار لندن میں رضا کاظم کے فلیٹ پر فیض صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں رضا کاظم ان کی بیگم نسیم اور ان کے بچے بھی ایک کمرے میں مقیم تھے۔ لیکن فیض صاحب کے بیڈروم میں ہر وقت لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ برمنگھم میں بدر اور ان کی بیگم بھی آکر مقیم ہو گئی تھیں۔ ملاقاتوں میں ہر طرح کے لوگ آتے تھے۔ جن کی فیض صاحب ہر طرح کی ناپسندیدہ باتیں بھی برداشت کرتے رہتے۔ پھر رات گئے تک تنہائی اور یکسوئی میسر نہ آتی۔ لیکن کیا مجال کہ کبھی چہرے پر بددلی کے آثار پیدا ہوئے ہوں۔ کبھی کبھی تو اپنے مخالف کو ایسا مختصر جملہ اپنے دھیمے لہجے سے کہہ دیتے کہ مخاطب گھائل ہو جاتا۔ ایک دن علی الصبح جب وہ چائے کہ گھونٹ لیتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کے بادل بنا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا فیض صاحب یہ بتائیں آخر آپ نے یہ صبر و ضبط کہاں سے سیکھا اور اسے اس طرح عادت ثانیہ بنالیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کبھی آپ کو کسی دشمنی کی بات پر بھی مکدر ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ یہ تو تم بھی کر سکتی ہو مگر تم تو رونے لگتی ہو۔ میں نے کہا" آپ کی شاعری کے نازیبا الفاظ کہہ رہے تھے۔ پھر وہ کون سامنہ لے کر آپ سے خوش خلقی سے دوست بن کر ملتے ہیں"۔ فیض صاحب مسکرادیئے۔ "ارے بھئی یہ معمولی باتیں ہیں انسان کو معاف کر دینا چاہئے ہوتی آئی ہے۔۔" اور پھر مجھے وہ رات یاد آئی۔

فیض صاحب کا ایک رخ' میں رشیا کی تعریفوں پر اکثر چڑ جاتی تھی۔ مگر بنے بھائی کی وفات پر وہی نفرت مجھے فیض صاحب کے چہرے پر چند سیکنڈ نظر آئی اور پھر جدائی کا صدمہ چھا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہتے رہے۔

کانفرنس ختم ہو گئی بنے نہیں آئے' مجھے بتایا گیا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہے' اس لئے بستر سے اٹھ نہیں سکتے۔ میں نے انہیں دیکھنے جانا چاہا تو کہا گیا تم کو ان کے ساتھ آج ہی ہندوستان جہاز سے جانا ہے۔ مگر میرے پاس ہندوستان کا ویزا ہی مشکل ہو گا۔ کہا گیا کہ سب ہو گیا۔ آپ کانفرنس کے بعد سیدھے ایئر پورٹ چلیں جب میں جہاز میں بیٹھ گیا تو بنے بھائی ہوائی جہاز میں سوئے ہوئے تھے۔ ایسی نیند کہ ان کے اپنے بچے بھی ہندوستان میں نہ اٹھا سکے۔ پھر وہ گلاس میں برف ڈالتے رہے اور کئی منٹ میں کئی بوتلیں گلاس خالی کرتے رہے اور ہمارے دماغوں میں خالی بوتلیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ کسی پر شاستری کا لیبل لگا تھا۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا لیبل لگا تھا۔ اور بنے بھائی کا لیبل ہندوستان میں تیار ہو رہا تھا۔ اور سب کے لب بند تھے۔

فیض صاحب فوجی وردی میں بڑے پیارے لگتے تھے۔ فیض صاحب نے پہلی دفعہ مجھے اور بھائی صاحب کو کھانے پر بلایا تھا۔ اور میں صبح سے خوش تھی۔ فیض صاحب پر میں نثار تو تھی ہی مگر اس شام بیرک کے باہر کھانے کی چھوٹی سی میز پر جھکی لمبی تڑنگی' اونچی سفید شلوار پہنے اور لٹھے کا دوپٹہ دو چوڑے فیتے کی طرح لٹکائے بیگم ایلس جب کھانا لگانے میں بیرے کی مدد کرنے آئیں تو میں حیران رہ گئی۔ اداس بھی ہوئی۔ وہ ہلکا ہلکا دکھ مجھے آج بھی یاد ہے۔ جس میں پچھتاوے بھی شامل تھے اور ادھر مرا بے نیاز شاعر ململ کا براق کرتا پہنے' مسکراتی آنکھوں میں چمک لئے گلاس اور بوتل سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ اس دن وہ مجھے اور بھی اچھے لگے۔ جب میری آٹوگراف بک پر لکھ کر دیا تھا۔

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسن دو عالم سے
مگر یہ دل کے جس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

ہاں بھئی سناؤ مجاز کی نظم سحاب۔ ایلس سحاب سے سنو۔ ہاں بھئی ہو جائے' مصرعہ درست کر دیں۔ "شہر کی رات اور میں سڑکوں پہ آوارہ پھروں"۔ نیلی آنکھوں والی یہ سچ مچ کی میم جو بجلی کی طرح کھٹاک کھٹاک کام کرنے والی۔ کل پرزوں کی' سنہرے بالوں والی۔ ہندوستانی لباس پہنے

والی گڑیا۔ فیض صاحب ٹھیک ہی لے آئے۔ میں نے سوچا تھا۔ اتنے دھیمے انداز میں سوچنے والے شاعر کو ایسی ہی عملی جامہ پہنانے والی خاتون کی ضرورت تھی۔ یہ تو اب بہت سی راہیں اتنے سالوں کے بعد دماغ سے نکلیں۔ تو سوچ کے فارمولوں نے سمجھایا۔ (Muzwell Hill) کی رہنے والی ایلس نے مجھے ماڈل ٹاؤن کی ایک اداس شام میں خشک پتوں پر ٹہلتے ہوئے بتایا تھا' اور وہ اتنے برسوں بعد اس وقت مجھے انگریز بھی لگی تھیں جب وہ کہہ رہی تھیں۔ "اس ملک میں سب فیض کو جانتے ہیں۔ سب فیض کو پیار کرتے ہیں۔ چھمی اور منیزہ میری دو ساتھی ہیں وہ جب مجھ سے ملتی ہیں تو میں خوش ہو جاتی ہوں۔ وہ میری بیٹیاں نہیں میری دوست ہیں"۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ آج یہ کتنی اچھی اردو بول رہی ہیں۔ مجھے پہلے دن یاد ہے جب انہوں نے کہا تھا "آفتاب تم مونگ کی ڈال کھاتے ہو۔ ہم نے آج مونگ کی ڈال پکائی ہے"۔ ہر چیز کتنی بلد گئی ہے۔ ان کو یہ بھی شکوہ تھا کہ فیض کو جتنا لوگ چاہتے ہیں ان کے دوست احباب ان کو اتنا زیادہ پلاتے ہیں جو ان کے لئے نقصان دہ ہے۔ وہ تو پیار محبت میں ان کو پلاتے رہتے ہیں۔ یہ دوستی نہیں دشمنی ہے ان کے ساتھ۔ نہ ان کے کھانے کا ٹائم ہے۔ نہ سونے کا۔ صرف بیروت ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں میں ان کے ساتھ رہی اور انہیں وقت پر کھانا پینا ملا۔ مگر وہاں صبح شام بموں کی بوچھار تھی۔ اور فیض اپنے ملک سے باہر رہ کر بہت اداس ہو جاتے ہیں۔ جس زمانے میں فیض صاحب پہ پابندی تھی کہ پاکستان نہیں آسکتے تھے' ٹیلیویژن پر دونوں بچیوں اور دامادوں کے پروگرام بھی بند کئے جا چکے تھے۔ جیسے کہ ہمارے عوام کا مزاج اور قاعدہ ہے کہ کچھ سالوں بعد ہر حکومت سے خفا ہو کر اس کا بھرکس نکالنے کے لئے میدان تیار کر لیتے ہیں۔ اور ہمارے اخبار اور پریس اگر کسی شاعر اور نغمہ نگار یا گلوکار یا کسی سیاسی ہستی سے خفا ہو جائیں تو اس کے آباد اجداد کے سارے برے کاموں کی فہرستیں تیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کچھ دنوں سے فیض صاحب سے سارا ملک خفا تھا۔ بچوں پر عتاب تھا۔ فیض صاحب کا نام نشر ہونا بند ہو چکا تھا۔ تہمت یہ تھی کہ بہت سے پروگرام ان کو ملتے ہیں۔ ملک کے باغی کی اولادیں ہیں۔ ایلس بھابھی بھی کافی رنجیدہ تھیں اس بات پر۔ بھلا میں کیسے کہتی "آپ کو نہیں معلوم کچھ دنوں کی بات ہے پھر آجائے گا پیار فیض صاحب پر ان کے خاندان پر فکر نہ کیجئے۔ پھر آپ لوگ پیارے لگنے لگیں گے"۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جس زمانے میں فیض صاحب جیل میں تھے تو ایلس بھابھی مجید ملک کے گھر میں "Happy Home" میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ہم لوگ دل ہی دل میں ان کے ضبط کی داد دیتے تھے۔ پھر کالم

بھی باقاعدگی سے لکھتی تھیں۔ جو ذریعہ معاش تھا۔ سگریٹ جمع کر کے کتابیں رسالے سب بھیجتی رہتی تھیں۔ آمنہ آپا اور ڈاکٹر شوکت کی گاڑیاں کون کون سی جیلوں میں نہیں گئیں۔ انگریز بیوی کے کئی بڑے فائدے بھی ہوتے ہیں۔ ایک تو ہر وقت جلتی نہیں۔ رونے دھونے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ خاموشی سے بچے بھی پالتی رہیں۔ ماں باپ کا پیار بھی دیا اور صحافت سے پرورش بھی کی ان کی۔ عورت چاہے مغرب کی ہو یا مشرق کی، اس کی قربانی اس کی چاہت پر ہمیشہ نثار رہی۔ عورت عظیم ہے۔ اتنی بڑی ذمہ داری اکیلے فیض صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔

جیل میں رہ کر خوبصورت کتابوں کے خالق نے یکسوئی سے شاعری کی۔

فکر منزل ہے نہ ہوش جادہ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے

میرا سچا شاعر چپکے چپکے ایک خاموش سوچ، سادگی و پرکاری سے چاروں طرف پھیلا دیتا ہے۔ فیض نے زندگی سے محبت کرنا سکھائی۔ ان کا اپنا ایک اسلوب ہے، جس میں فارسی، عربی، مغربی و مشرقی، تہذیبی سوچ کو نئے اچھوتے لفظوں سے منقش کیا۔ ان کی محبوبہ بھی انوکھی ہے۔ دار و رسن کے پھولوں کی سیج سجانا، نہ ملنے کی چاہت، استعارے۔ اشارے کنائے ہی ان کی شاعری کا حسن ہیں۔ یاد اسیری میں کتنی محبوبائیں، جن کا صرف قفس سے تعلق نہیں تھا۔ یہ ان کے ذہن کا حسن ہے، جو صبح شام کو وہ لباس پہناتے ہیں۔ تنہائیوں کی محفلوں کے پیکر خاموشی سے کیسے کیسے بلوری جاموں میں سجا گئے۔

فیض کی شخصیت کو ۱۹۵۰ء کی روشنی میں دیکھئے تو وہ جو ایک شخص ایک رات محل چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اپنی ذہنی لڑائی سے تنگ آ کر۔ آخر ضمیر کی آواز نے فتح پائی۔ وہی روح، وہی شخص، فیض کی روح میں سما گیا تھا جیسے۔ اور وہ اپنی کھڑادیں چھوڑ گیا تھا۔ بڑی سے بڑی تکلیف کو وہ ناصح کے سر تھوپ دیتے اور خود بڑی بڑی آنکھوں سے خلا میں گھورتے رہتے۔ سگریٹ پہ سگریٹ جلاتے رہتے اور گلاس کو بھرتے رہتے۔ ریڈیو اسٹیشن کے سامنے جیل خانے جانے سے پہلے ایک زمانے میں رہا کرتے تھے۔ اور میری تو عید تھی، اس زمانے میں ہر وقت جب وقت ملتا چلی جاتی۔ شام کے جھٹپٹے میں چنار کے درختوں سے جب دھوپ اترتی تو وہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے ملتے۔ بظاہر وہ مہمانوں سے بھی باتیں کر رہے ہوتے، مگر وہ وہاں نہ ہوتے۔ آنکھوں میں سوچ کا خمار لئے ایسا

بدھاپن لئے آسمان کو گھورتے رہتے۔ خلا میں جیسے انہیں سمجھوتے نظر آتے ہوں۔ چہرے پہ دیالو پن کی لو جلتی رہتی۔ کتنے ہی مخالفین جب ان کے سامنے آتے مرجھا کے چلے جاتے۔ وہ اپنے سہج پن سے، دھیمے لہجے سے گھائل کر دیتے۔ کبھی بھی کسی سے نہیں لڑتے۔ میں نے ایک دن انہیں لندن میں بتایا۔ ن۔ م۔ راشد اور ایک اور شاعر جو اپنے آپ کو راشد کے برابر سمجھنے لگے ہیں اپنے آپ کو نقاد بھی سمجھتے ہیں۔ آپ کے بارے میں اور آپ کی شاعری پر بڑی نازیبا باتیں کر رہے تھے۔ ان سے کہئے کہ وہ آپ کے منہ پر کہیں وہ سب باتیں۔ تو ہنس دیئے۔ ارے بھئ، انسان کو معاف کر دینا چاہئے۔ کیسا پوتر انسان تھا

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا

وہ تیرا کفن۔ وہ میرا کفن۔ اور پھر وہ سانحہ۔ ان کے مسیحا کی موت کی خبر کون دے اور اس رات سب پریشان تھے کہ آپ کو ٹیلیفون پر کون بتائے۔ کسی کو ہمت نہیں تھی کہ لاہور ٹیلیفون کر کے۔ آپ کی صادق محبوبہ کی موت کی خبر آپ تک پہنچانا اس لئے دشوار تھا کہ آپ پر کیا گزرے گی اس کے بعد۔ سب آپ کو اتنا چاہتے تھے کہ آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ اور اس حادثہ کے بعد فیض نہیں رہے تھے اور رفتہ رفتہ خاموش ہو گئے تھے۔

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا

اور آپ چپکے چپکے ہر شفاف چہرے میں وہ نقش بنانے لگے۔ اور پچھلی لذتوں پچھتاؤں۔ دکھوں کو مہمان کر کے پھر سے فیض سے ملاقات کرتے۔

لندن میں اس شام خالد حسن کی گاڑی میں ہم سب جا رہے تھے تو فیض صاحب نے کہا تھا کل رات جب میں اپنی سالگرہ کا کیک کاٹ رہا تھا۔ تو دل میں خوفزدہ تھا کہ کوئی ایسی خبر نہ آئے۔ کہیں یہ خوشی چھن نہ جائے۔ وہی ہوا۔ آج افضل نہیں رہا۔ میں تو خوش ہوتے ہی اب ڈر جاتا ہوں۔ اور پھر آپ کی طبیعت خراب ہوتی گئی۔ سگریٹ۔ اور رت جگے اور پھر

آشنا موت جو دشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے

اب اور کسی فردا کے لئے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجئے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکین دل ناداں کیجئے

٭

کھلے جو ایک دریچے میں آج حسن کے پھول
تو صبح جھوم کے گلزار ہو گئی یکسر
جہاں کہیں بھی گرا نور ان نگاہوں کا
ہر ایک چیز طرح دار ہو گئی یکسر

(جناح اسپتال کراچی)

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے
اب کوچہ دلبر کا رہرو رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے
ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

(منٹگمری جیل ۱۷ جون ۵۳ء)

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

(جناح اسپتال ۵۳ء کراچی)

تیرے کوچے سے لے کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

پھر پہلی بار۔ اسلامی رسم کے خلاف میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک انگریز بیوہ کے توسط سے قبرستان میں۔ عورت ہونے کے ناطے سے انسان، موت اور قبر تک کا آخری سفر دیکھا۔ فیروزہ نے بھی سمجھایا تھا کہ قبرستان میں عورتیں نہیں جاتیں تم مت جاؤ۔ مگر انگریز بیوہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے بہت سی انگریز بزرگ خواتین بھی تھیں۔ اور سب کی کاریں قبرستان میں جا کر رکیں۔ تو میں بھی فیروزہ کی گاڑی زبردستی لے کر ساتھ ہولی۔ میں فیض صاحب کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ اور اپنے چہیتے دوست کی موت پر اداس تھے۔ فیض صاحب ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح کوٹ اور رشین ٹوپی میں چہرہ چھپائے کھڑے تھے۔ مجھے پھر پیار آگیا۔ میں نے ان کے بازوؤں کو اپنے بازوؤں سے سہارا دیا۔ تو ان کے ہاتھ برف کے ٹکڑوں جیسے تھے۔ وہ کانپ رہے تھے۔ کیونکہ اس وقت دو انگریز گور کن پھاوڑے اٹھائے قبر میں تختے رکھ کر ان پر مٹی گرانا چاہتے تھے۔ اور آیتیں پڑھنے والے کا انتظار تھا۔ آیت ختم ہوتے ہی دو پھاوڑوں میں مٹی اور پتھر بھرتے گئے۔ نیچے افضل صاحب کے صندوق کے پٹڑوں پر جیسے ہی ملبہ گرا۔ تو میں اور فیض صاحب پورے کانپ گئے۔ سنگسار ہونے والے کو تکلیف ہوئی ہوگی یا نہیں مگر فیض صاحب کا پورا وجود پتھروں سے بوجھل ہو رہا تھا۔ عین اسی وقت "طارق علی صاحب" ڈفل کوٹ پہنے رولز رائس میں سے اترے جس کو انگریز شوفر چلا رہا تھا۔ چند لمحوں میں بہت سی نظروں نے صف میں کھڑے کالے لباس میں ملبوس کامریڈوں نے خاموش پیغام و سلام لئے۔ پھر وہ خاموش گیلی مٹی پر نظریں گاڑے برف کی پھوار سے مٹی اور قبر کے اوپر رکھے ہوئے پھول دیکھتے رہے۔ چند منٹوں میں رولز رائس اور ڈفل کوٹ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔ کچھ یہودیوں کی لمبی ناکوں والے کامریڈ کالے لباسوں اور ٹوپیوں کو درست کرتے ہوئے پھولوں سے منڈھے ہوئے حلقوں کو قبر کی ابھرتی مٹی پر رکھتے گئے۔

بارش کے بجائے اب قدرت نے ننھے منے اولے برسانے شروع کر دیئے۔ یعنی کامریڈ کی وفات پر روس کی ٹھنڈک اللہ میاں نے بھیج دی۔

تو ادھر میں بغیر کہے سنے فیض صاحب کی لاٹھی بنی۔۔۔ ان کو کار تک لے گئی۔ افضل صاحب کی بیوہ کالے لباس میں اپنے ماں باپ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ شاید کسی انگریزی رسم کا انتظار تھا۔ میری نگاہیں کار میں بیٹھے فیض صاحب پر پڑیں سوچتی ہوئی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی پلکوں

پر سفید موتی لرز رہے تھے۔ اداس چہرے سے جیسے الوداعی منظر کی ساری بیقراری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اور چہرے پر ہونٹوں کی مسکراہٹ دھوکہ دے رہی تھی۔ میں انہیں رنجیدہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ان کا سارا غم میں ان سے چھین لوں۔ دفعتاً شرارت سے چیخی۔ "ٹھہریئے۔ ٹھہریئے" وہ چونک گئے بلکہ دہل گئے۔ میں نے اپنے مفلر میں دونوں موتی چھپالئے۔ جو گرنا ہی چاہتے تھے بہت چاہا کہ پی لوں مگر ساری عمر کی چوری پکڑی جاتی کہ یہ بھی مجھے اتنا چاہتی ہے۔ اور میرا نام بھی ان کی لسٹ میں اضافہ کر جاتا۔ اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مجھے تھپتھپاتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکے "تم بھی بڑی' بیہودہ ہو باجی' بالکل پگلی کہیں کی۔ اچھا بھئی تم اتنی ہی خوش رہو کوئی تو خوش رہے" اور میں سچ مچ خوش ہو گئی کہ فیض صاحب مسکرانے لگے تھے۔ میرے فیض صاحب کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ ہم سے زیادہ ان کو کوئی نہیں چاہتا۔ ابھی کچھ دن ہوئے جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں۔ میں دلی میں عینی کے گھر میں بیٹھی فیض صاحب کی باتیں کر رہی تھی۔ ہم دونوں ہی ان کی موت پر غمگین تھے۔ اس نے اپنا البم دکھایا۔ اور فیض صاحب ویسی ہی محبت سے جیسے مجھے دیکھتے ہی گلے میں بانہیں ڈال دیتے تھے۔ ویسے ہی ماسکو میں عینی کے کندھے پر ہاتھ رکھے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ اور عینی بھی اتنی ہی خوش تھی۔۔ جیسے میں ان کے ساتھ لپٹ کر خوش ہوئی تھی کہ فیض صاحب مجھے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ کہیں بھری محفلوں میں، میں نظر آجاؤں۔ اسی طرح پیار سے گلے ملتے۔ جیسے پہلے دن ملے تھے۔

ہم سب سے روٹھ کے جانے سے دو مہینے پہلے میری آخری ملاقات فیض صاحب سے جب کراچی پریس کلب میں مجاز کے ساتھ ایک شام کی تقریب میں ہوئی۔ یہ تو ہم سب کی خوش بختی تھی کہ فیض صاحب بھی کراچی آگئے۔ نئے نئے ماسکو اور بیروت سے آئے تھے۔ سنا تھا بڑے سخت بیمار تھے۔ دیکھا تو حیران رہ گئی۔ بہت دبلے ہو گئے تھے۔ عجب عجیب لگنے لگے تھے۔ ایسے جیسے فیض صاحب کے چہرے پر رکھ کر دوسرا موم کا چہرہ بنا دیا ہو۔۔ "میڈام ٹوسیوڈ" نے بنایا ہو۔۔ جب بولے تو آواز فیض صاحب کی تھی۔ میرے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بار بار سوچتی کس سے کہوں۔ یہ مجھے ہی محسوس ہو رہا ہے۔ کہاں کھو گئے وہ میرے فیض صاحب۔ میرا شاعر جو بیروت گیا تھا۔ جس کو اب کے جلاوطنی کی کونسی بھٹی میں تاپ کے بھیجا ہے۔ لوگ گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ ہجوم میں کبھی کبھی تھکا ہوا چہرہ نظر آجاتا۔ ایسی تھکن جیسے اس بوجھ سے اکتا گئے

ہوں۔ صرف مسکراہٹ وہی تھی۔ مگر چہرہ پر کوئی خاص تبدیلی ہوئی تھی۔ اگر دبلا ہو کر انسان ایسا کھو جائے چہرے پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جو میرے فیض صاحب سے ملتی جلتی ہو۔ جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو انہوں نے مجھے بھی دیکھا۔ مسکرائے کیوں کہ مجاز پر بول رہے تھے۔ نئے کراوڈ میں بہت کم لوگوں نے مجاز کو دیکھا تھا۔ ان کا کلام تو کیا یاد ہو گا۔ ان کے ذہن میں بھی اور میرے ذہن میں بھی مجاز کا وہ زمانہ تھا جب مجاز زہرہ آپا کے میدہ شہابی رنگ پر نثار تھے۔ اور چمپئی چنے ہوئے دوپٹے کے آنچل کو پرچم بنوانے کا سوچ رہے تھے۔ شوکت اللہ انصاری کی بیلا روڈ کی کوٹھی میں برآمدے میں اکثر سہ پہر کو موتیا کے پھولوں بھری میز کے چاروں طرف زہرہ آپا۔

حمیدہ سلطانہ 'ان کی بہنیں' مجاز' جذبی' فیض صاحب' ڈاکٹر رشید جہاں جو اکثر زہرہ آپا کے گھر ٹھہری رہتیں۔ جو میم تھیں اسی وقت میں اور ان کی ساری حرکتیں آج کل کے ہپیوں والی تھیں۔ جواب سمجھ میں آتی ہیں۔ اکثر یہ لوگ گھنٹوں ایک دوسرے کو لیکچر دیتے رہتے۔ میرے پلے تو کچھ بھی لفظ نہیں پڑتے۔ انقلاب اور سوشلزم کے علاوہ۔ نہ جانے اکثر میں کیوں بلائی جاتی تھی۔ اور میں خود کیوں جاتی تھی۔ گھر کی اتنی پابندیوں کے باوجود۔ مگر فیض صاحب کو کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ مجھے بلاتے تھے۔ جمنا پر شام کی چائے ہو رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گروپ علی پور روڈ پر ٹہلتے رہتے اور میں بھی شریک رہتی۔

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ کون جا رہا ہے شب غم گزار کے

شاید یہ سنانے جاتی تھی۔ یا کسی بہانے سے میری وہ تمنا پوری ہو جاتی کہ فیض صاحب کو دیکھ سکوں۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

ہاں بھئی سحاب ہو جائے اور آنکھیں بند کئے مونڈھے میں دھنسے رہتے سب کے ہنسنے پر کبھی کبھی آنکھ کھول کر شریک ہو جاتے۔ مجاز تو میرے بھائیوں کے دوست تھے۔ ان کا کوئی رعب وغیرہ نہ تھا۔ نہ ان کے آنے جانے سے دل میں آہٹ ہوتی دلی میں مجاز' صابر' منخشب' خمار' شکیل' جگر

صاحب اکثر آتے ہی رہتے تھے۔

تالیوں کے شور سے پتہ لگا کہ مجاز کا شو ختم ہو گیا تھا۔ لوگ فیض صاحب سے ان کا کلام سننا چاہ رہے تھے۔ ایسا لگا کہ میں اور وہ ایک ساتھ مجاز کو یاد کر رہے تھے۔ فیض صاحب نے رباعی پڑھی۔ اور ادھر میں مسکرادی اور وہ بھی مسکرا دیئے۔ ہم دونوں کو مجاز' زہرہ آپا اور ڈاکٹر رشید جہاں یاد آرہے تھے۔۔

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ تیرے گیسوؤں کی رات نہیں

آئے تو یوں کے جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

انہیں بھی معلوم تھا۔ یہ کب لکھی گئی اور مجھے بھی معلوم تھا۔ اک اور ہمراز تھی' وہ آمنہ آپا' ان کے ساتھ تھیں۔ جب چلنے لگے تو میں بھی ملنے گئی۔ گلے لگایا۔ کہاں ہو بھئی! کب آئیں پاکستان؟۔ تمہارا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ چلو ابھی میرے ساتھ۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی۔ "اچھا تو تم کل صبح آجاؤ آمنہ کے گھر۔ انہوں نے لقمہ دیا۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تک۔" اور کندھے پر ہاتھ رکھے کار تک پہنچایا۔

دوسرے دن گیارہ بجے میں آمنہ آپا کے ہاں پہنچی۔ تو ایلس بھابھی' نعمان بھائی کے پاس بیٹھی تھیں۔ گویا نعمان بھائی آئے تھے مجھ سے بھی پہلے۔ ایلس بھابھی نے میری طرف دیکھا تو جلدی سے بولیں۔ کل میرے سامنے سحاب کو بھی گیارہ بجے بلایا۔ اب جو انسان رات کے دو بجے تک جاگے گا تو صبح کیسے اٹھے گا۔

"He Should have some rest at least".

سحاب، فیض کو میں بارہ ایک بجے تک اٹھاؤں گی۔ تب تک ہم لوگ باتیں کرتے ہیں آپس میں۔ بیٹھو۔ کل رات پھر ایک بجے سوئے۔ میں نے صبح ناشتا دیا ہے۔ اور وہ بارہ بجے تک کمرے سے باہر نکلیں گے۔ ڈاکٹر خفا ہوتے ہیں۔ میں ابھی سوچ بھی نہ پائی تھی کہ کیا کروں۔ نعمان بھائی اٹھنے لگے۔ تو آمنہ آپا نے کہا۔ بیٹھو میاں۔ سحاب بھی ہے۔ ابھی بارہ بج ہی جائیں گے۔ پھر چپکے سے بولیں یہ تو ایلس کی ضد ہے۔ بیٹھو۔ وہ دکھیا تو کمرے میں لیٹے کڑیاں گن رہے ہوں گے۔ خاک آرام کر رہے ہوں گے۔ ان کی طبیعت تو باتیں کر کے اچھے لوگوں سے مل کر خوش ہوتی ہے۔ اور میں نے سوچا کتنی سمجھ دار ہیں کیسے ان کو سمجھتی ہیں۔ مجید ملک صاحب جب سے فوج میں آئے تھے ان کا گھر فیض صاحب کا دوسرا گھر تھا۔ اور میں بہانہ کر کے چلی آئی۔ گاڑی کسی کی ہے۔ شام کو مشاعرے میں مل لونگی۔

مشاعرے میں فیض صاحب جب پڑھنے لگے مجھ پر نظر پڑی۔ مسکرائے۔ گویا میری شکایت سن لی۔ شعر پڑھے جب پڑھنے لگے تو ان کو بھی ان کی مسیحا یاد آئیں اور مجھے بھی۔

اور ہم دونوں ہنس پڑے۔ کاش میں اس دن تھوڑی دیر اور رک جاتی۔ ان سے مل ہی لیتی۔ نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے۔ جو مجھے بلایا تھا۔

آج تم۔۔ کل ہماری باری ہے۔ فیض صاحب۔ بنے بھائی (سجاد ظہیر) کے تصویر پلنگ کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی ان کو دیکھ لیتی ہوں۔ یہ تصویر ماسکو کی ایک کانفرنس کی تھی۔ زینے کے ایک طرف فیض صاحب کھڑے ہیں۔ ایک طرف بنے بھائی۔ لندن ہی ایک ایسی جگہ ہے جس شہر کے کمروں میں اگر بنے بھائی، فیض صاحب، فراز، امرتا پریتم، عصمت، پدما چ دیو، بیدی، سردار، کیفی۔ آجائیں تو پینتیس (۳۵) چالیس (۴۰) سال کا عرصہ ہمارے اور ان کے درمیان محسوس ہی نہیں ہوتا۔ ان کمروں میں سگریٹ کے دھوؤں اور کانچ کے گلاسوں سے ابھرتی ہوئی۔ آنکھیں۔ آوازیں۔ یہ سب کیسی محبت کی گرمی۔ اپنے ملک کی دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت لئے ہوئے ہے۔ میزبان ایسی محبت کرتے ہیں۔ اپنی اپنی گاڑیوں میں چھوڑنے میلوں، خوشی خوشی لے جاتے ہیں کیونکہ ان کی ذہنی آسودگی انہی لوگوں سے ملتی ہے۔ فیض صاحب اور بنے بھائی اگر اس ٹھنڈے بیچارے جیسے شہر میں آجائیں۔ تو ہم سب کی روح پھر سے جوان ہو جاتی ہے۔ جسم تو غلام ہے اس ملک میں۔ دل و دماغ میں یادوں کے ذخیرے بھرے ہوئے ہیں۔ اور اب محبوبوں کی جگہ ادیب و شاعری رہ گئے۔ اور فیض صاحب تو ہر گھر کے محبوب تھے۔ میں نے

ایسے چاہنے والے دیکھے کہ گھر کے میاں بیوی نے بس ان کی محبت میں ایک ساتھ سوچنا اور چاہنا شروع کر دیا تھا۔ کئی کئی مہینوں کی روٹھی ہوئی بیویاں تک چالیس آدمیوں کا کھانا، مسکرا کر پکاتی دیکھی گئیں۔ کئی تلخ ازدواجی زندگیاں میں نے فیض صاحب کی آمد پر ایک ساتھ بیٹھی قہقہے لگاتی دیکھیں۔ فیض صاحب سے زیادہ مقدار میں بوتلیں خالی کرتے ہوئے۔ شوہروں کو بیویوں نے فیض صاحب پر سے نچھاور کر دیا۔ کھلی چھٹیاں مل جاتی تھیں۔ ہر ایک کو 'رات رات بھر جمعہ' ہفتہ' اتوار لندن میں جشن مناتے رہتے۔ فیض اور بنے بھائی آئیں تو۔ ہر گھر میں ٹیلیفون حرکت میں آجاتے۔ ہر جوڑا اپنا اپنا توشہ ساتھ لئے۔ خود کو مدعو کر لیتا۔ فیض صاحب جب بھی لندن آتے ضرور فون کرتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ میرے گھر نہ آئیں۔ فیض صاحب کی وجہ سے نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آجاتے۔ کچھ لوگوں کو فیض صاحب اپنے آپ ہی دعوت دے آتے۔ اور آہستہ سے کہتے بھئی میرے کچھ دوست بھی آئیں گے۔ جو میرے ساتھ جیل میں تھے۔ مل گئے وہ یہاں۔ اور کچھ دوست آدھی رات کو گاڑیوں میں بھرے نان کباب اور بوتلوں سے گودیں بھری ہوئی آجاتے۔ اور میں سٹپٹا کر رہ جاتی کہ کہاں بیٹھیں گے یہ لوگ مگر سب کمروں' گیلریوں اور سیڑھیوں تک پر بیٹھے شعر سنتے اور سر دھنتے رہے اور آخری دفعہ تو جب خالد حسن پریس کونسلر تھے لندن میں اور علوی بھائی بھیم کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اپنی جیبوں کو خالی کر دیا کرتے تھے۔ میری جیب تو ہمیشہ خالی رہی۔ سگریٹ' شراب' لوگ خود لے آتے۔ میں تو صرف دعوت شیراز کا انتظام کرتی۔ کچھ ایسے بھی آتے جو۔۔۔ چراغ میں بتی پڑی اور لاڈو کوٹھے چڑھی۔۔ والی مثال پر عمل کرتے۔۔ ان کے شعر بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ کچھ تو عینکوں کے اندر ہی غائب رہتے۔ ساری رات سوتے' کیونکہ بڑی گاڑیوں کے مالک جو تھے۔ کچھ خواتین و حضرات ایک ہی پیاس میں تشنہ نظر آتے۔ کچھ چہرے ایسے تھے جو فیض صاحب کے لئے آتے۔ آکسفورڈ' کیمبرج' برمنگھم' لیڈز' مانچسٹر' گلاسکو' اسکاٹ لینڈ سے اتنی دور دور کی مسافت طے کر کے انہیں سننے' ان سے ملنے آتے تھے۔ صرف چند گھنٹوں کے لئے۔ فیض صاحب کے کمال فن کو عالمگیر شہرت ملی۔ لیکن انہوں نے نہ کبھی غرور کیا۔ نہ کبھی تکبر کا اظہار کیا۔ بلکہ ایک بڑے آدمی کی طرح یہ کہا "حقیقت میں گلہ ہے تو اپنے آپ سے کہ عزیز دوستاں ہونے کے لئے کسب کمال میں جتنی سعی و تلاش لازم تھی میسر نہ آسکی۔"

غم عشق کے علاوہ انہیں غم ہائے دیگراں بھی ستاتا تھا اور خوبصورت زندگی کے لطف اور

شادمانیوں کے لئے وہ دوسروں کو بھی پورا پورا حصہ دار سمجھتے تھے۔ چنانچہ کس امید سے کہتے ہیں۔۔

نصیب صحبت یاراں نہیں تو کیا کیجئے
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
یہ رقص سایہ و سرو و چنار کا موسم
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم
کون قاتل بچا ہے شہر میں فیض
جس سے، یاروں نے رسم وراہ نہ کی
جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی
(جناح ہسپتال ۱۹۵۳ء)

ہمارے دم سے رہی ہے جہاں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیرو تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں، سر گلزار ہے کون
شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لئے مشعل رخسار ہے کون
رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھیں
آج بکھرائے ہوئے زلف طرحدار ہے کون

پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانئے پھر دلِ وحشی کا طلب گار ہے کون

(جولائی۔ جناح اسپتال)

انگلستان، ہندوستان کے گلے میں بانہیں ڈال رہا تھا۔ انشاء، نذیر بھائی، فریدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خالد حسن نے کانپتے ہاتھوں سے وہسکی کے گلاس میں کئی برف کے ٹکڑے گھبراہٹ میں ڈال دیئے۔ سامنے صوفے پر بجی بنی سفارت خانے کے افسران کی بیویوں نے اپنے پہلو بدلے اور دوسرے پوز بنا کر فیض صاحب کی دوسری نظم سننے کے لئے تیار ہو گئیں۔
کئی ایک نے کنکھیوں سے اپنے اپنے میاؤں کی نظروں کا ٹارگیٹ دیکھ کر۔ نئے بال جو وہ بیوٹی پارلر سے ۲۰۔ ۲۵ پاؤنڈ خرچ کر کے کٹوا کر آئی تھیں۔ درست کئے۔ فیض نے اپنی نظم الیکشن سنائی۔ پاکستان کا نقشہ کھنچ گیا۔ ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہمارے پیار کا اظہار ابھی تک اسی روایت سے ہوتا ہے۔ باہر رہ کر اپنا ملک کتنا عزیز ہوتا ہے۔ یہ اس محفل کی موتیوں بھری آنکھوں کو معلوم تھا۔ یہ صرف وہ لوگ جانتے ہیں۔ جنہیں دیارِ غیر میں رہنا پڑتا ہے۔
فیض صاحب اپنے کچھ تازہ اشعار سنائے۔ موضوع نو آزاد الفرد ایشیائی ممالک میں الیکشن کا انعقاد تھا۔ فیض صاحب آپا کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتے تھے۔ فیض صاحب کے انتقال کے بعد جب میں آمنہ آپا سے ملی تو چپکی رہیں پھر آہستہ سے بولیں فیض صاحب اگر کراچی میں ہوتے تو اتنی جلدی نہ مرتے۔ ان کو میٹھا کھانے کا بہت شوق تھا۔ پیٹ ہمیشہ ہی خراب ہو جاتا تھا۔ میں آکر ان کو دوائیں دیتی رہتی تھی اسبغول اور دہی کھلاتی رہتی تھی۔ مجھے فوراً پتہ لگ جاتا تھا کہ ان کو کونسی دوا چاہئے۔ اس وقت بدپرہیزی تو دل بھر کے کرتے تھے۔ اتنی ہی دل جوئی اور محبت سے ایلس بھابھی کا بھی خیال کرتی ہوں۔ جب وہ یہاں آتی ہیں۔ یہ فیض صاحب کی ڈھیروں محبت ہے جو بچیوں اور بیوی پر نثار کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ایسی چاہے جانے والی شخصیت اب پیدا نہ ہو گی۔

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگائے آبگینوں میں

دل عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

شمع نظر خیال کے انجم جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

پھر اس رات لندن میں پہلی بار جب ہمی (سلیمہ) برسی میں آئی، تو فیض صاحب کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ ایلس بھابھی بھی ملیں۔ مگر ہمی ایسی مجھ سے لپٹ کر روئی جیسے اسے معلوم تھا مجھ کو بھی اس کے اور اپنے رونے سے سکون ملے گا۔ پیارا سا حسین چہرہ۔ ہمی کو اب بھی جب کبھی دیکھتی ہوں جیسے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ ایلس بھابھی کا میں کیا غم بتاؤں وہ تو اپنے غم میں شریک ہونے کا رواج بھی نہیں جانتیں مگر خوش ہو جاتی ہیں مل کر اللہ ان سب کو سکون دے۔

ایک مرتبہ ہمس فورڈ کلب میں جہاں سردار، ساحر، مجروح، مجاز، جذبی، کیفی، فیض صاحب اپنا کلام پڑھتے ہی اسٹیج کے پیچھے چلے گئے۔ ایک حسین عورت کیسی بے ساختگی سے مجھے پوچھنے آئی تھی۔ جس کے گلے میں پڑا ہوا ہیرے کا لاکٹ اس وقت سانس کی تیزی کے ساتھ مچل رہا تھا۔ وہ انگریزی میں مجھ سے التجا کر رہی تھی۔ مجھے صرف ایک دفعہ فیض سے ملا دیں۔ وہ کدھر گئے۔ اور میں نے سوچا ایسی خوبصورت آنکھیں فیض صاحب کو نہیں دیکھنی چاہئیں۔ اور پھر میں نے ایلس بھابھی سے ملا دیا تھا۔ یہ ان کی مسز ہیں۔ ان سے پوچھئے اور واقعی انگریز بیوی ہم سے اچھی ہوتی ہے۔ وہ کتنے پیار سے بار کی طرف لے گئیں اسے فیض صاحب سے ملانے۔ ایسے کئی ایک راز میں نے فیض صاحب کو نہیں بتائے تھے۔ ہر مشاعرے میں کتنی ہی لڑکیاں دیوانی ہو جاتی تھیں۔ فیض صاحب پر۔ یہ ایلس بھابھی ہی کا مزاج تھا جو ہر ایک سے مسکرا مسکرا کر ملتیں۔ اتنے چاہنے والے شوہر کی بیوی کو بھی سونے کا تمغہ ملنا چاہئے۔ خوبصورت، ذہن انٹیلکچول میاں کے ساتھ بڑا مشکل ہے گزارا کرنا۔ کونسی بیوی ایسی سوچ رکھتی ہے۔ اگر میں اس کو اپنے ذہن میں بیٹھے بدھا کو دکھاؤں کہ میں تو صرف اس کی پرستش کرتی ہوں۔ آتے ہیں غیب سے جو مضامین خیال میں۔ اس کے لئے ان کو سجدہ کرتی ہوں۔ تو کون یقین کرے گا۔ پھر وہ فیض صاحب کی طرح معصوم بھی ہے

پوتر بھی، بے نیاز بھی۔ میرا شاعر بھی کسی کے لئے بے چین ہوا۔ وہ بھی کسی کو چاہتا تھا۔

"جولائی جناح اسپتال"

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سر گلزار ہے کون

کلرڈ پیشنٹ

انشا

آج گیارہ جنوری ہے۔ گلوسٹر روڈ پر نمبر ۱۳ بس گزری ہے۔ سامنے سیدھے ہاتھ پر تین منزلہ سفید فلیٹوں کی لمبی لمبی سی ڈوری سیدھی لکیر پر کھینچتی ہوئی دور تک چلی جا رہی ہے۔ ننھی منی کھڑکیاں سفید عمارت جس پر نیلے پیلے اودے دروازوں کی قطاریں سڑک کے کنارے پر مڑ جاتی ہیں۔ کچھ دروازوں کے اوپر مختلف فرموں کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ ایک سفید دروازے کی سیڑھیوں کے پاس گھنٹی کے نیچے ایک نام ڈھونڈ رہی تھی جو پلاسٹک کے لفظوں سے جوڑ کر لکھا گیا تھا۔ نیچے دفتر اوپر پانچ کمروں کا فلیٹ جس کی گھنٹی بجانے پر شلوار قمیص پہنے ہوئے عینک لگائے انشا نظر آتے۔

ارے بھئی بڑی دیر لگا دی۔ تم کہتی تھیں کہ دس بجے آؤں گی۔ پہنچتی ہو ۱۲ بجے۔ اوہو۔ اوہو' وہ کھانستے ہوئے ہنستے۔ پھر شلوار کے پائینچے ایسے اونچے کرتے جیسے نیچے پانی بہہ رہا ہو۔ پھر آنے والے سے پہلے خود جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ میں اتنی اونچی سیڑھیوں کو دو دفعہ سانس لینے میں طے کرتی اور وہ کمرے میں غائب ہو جاتے۔

"رومی دیکھو تمہاری آنٹی آگئی اپنے بسکٹ چھپاؤ" اور خود ہی زور زور سے ہنستے۔

انشا بھائی اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو یہ فلیٹ ضرور خرید لیتی۔ کاش یہ صرف انشا بھائی کا فلیٹ

انشاجی اور سحاب قزلباش
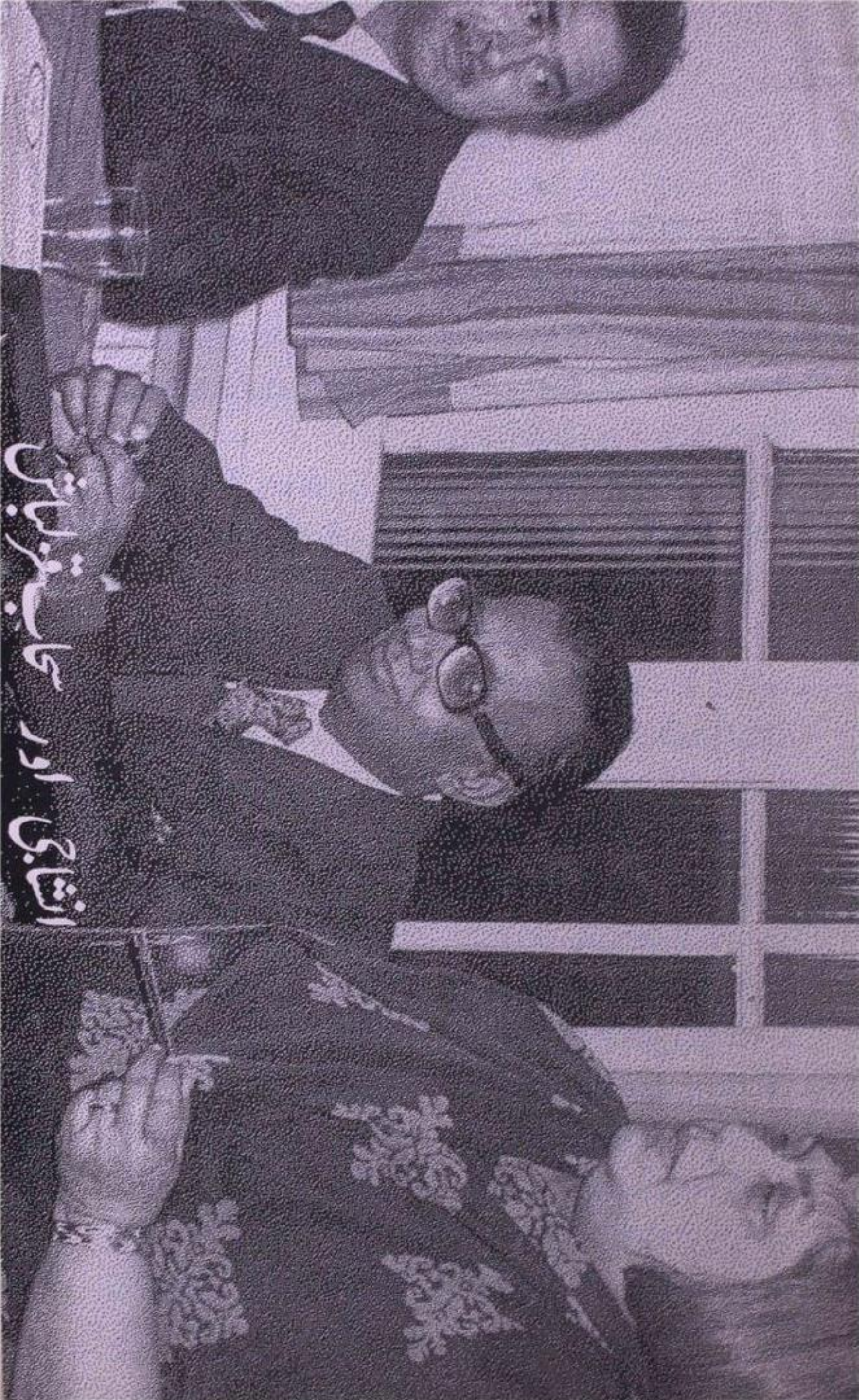
رہتا۔ ہر چیز کی کتنی جلدی تھی۔ ایجنٹوں کی فہرستیں ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہے ہیں۔ گھر ڈھونڈا جا رہا ہے۔ ایمبیسی میں جب کام کرتی تھی' وہ سب ایسے دن کھٹا کھٹ فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے پر گزر رہے ہیں۔ میں اور مودی دوپہر کو لنچ ٹائم میں ان کے کمرے میں بیٹھ کر ٹیلیفون کرتے رہتے۔ آخر کار گلوسٹر روڈ پر ۸۰ پونڈ ہفتے پر اچانک فلیٹ مل جانا معجزہ ہی تو تھا۔

اتنے تھوڑے سے مہینوں میں گھر بھی مل گیا۔ اتنا سستا اور ہارٹ آف لندن میں پانچ کمروں کا فلیٹ سلفرجز کے قریب مل جانا' اللہ میاں کی عنایت ہی کا نتیجہ تھا۔ سوائے اللہ میاں کے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی چلے جائیں گے وسیم نے بی بی سی کی کینٹین میں چپکے سے مجھے بتایا تھا کہ انشا کو کینسر ہے اس لئے علاج کے لئے آئے ہیں۔

اور اس دن کھانے کی میز پر وہ ہلکے ہلکے ہنستے رہے زرد چہرے پر لاکھ اداسی تھی مگر ان کے وہی چٹکلے' جملے اور فقرے ہر ایک پر کستے رہے۔ پھر ایمبیسی میں ہر روز تقریباً لنچ پر میں نذیر بھائی اور انشا کسی نہ کسی چھوٹے موٹے ریستوران میں مل جل کر لنچ کرتے' کبھی کبھی نذیر بھائی ایمبیسی کے کمرے میں کھاتے' اس وقت کبھی پاکستان کے بارے میں کبھی ہندوستان کے بارے میں کبھی لاہور کے ادیبوں کے سیکرٹ گوسپ مگر وہ ہمیشہ ہی چھیڑ کر خود چپ ہو جاتے۔ کئی مہینے ان کو مختلف کمروں میں اپنی میز لگانی پڑی۔ جس سے کتنے آزردہ ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں مجھے ہمیشہ کی طرح رسالہ نکالنے کی تکلیف رہی جس کا وہ ہمیشہ مذاق اڑاتے رہتے۔ بھابھی کے آنے سے پہلے کے انشا اور تھے بھابھی اور بچوں کے آنے کے بعد انشا کچھ اور تھے۔ آپریشن سے پہلے بھی انہوں نے اپنے زرد چہرے کے اندر کسی کو بھی جھانکنے نہیں دیا۔ جس دن وہ آپریشن کے لئے اسپتال داخل ہونے جا رہے تھے اس دن رومال پکڑتے ہوئے بھی ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ کوکا کولا کا ٹن کھولتے ہوئے بھی وہ چلتے چلتے ٹک جاتے تھے۔ کہہ کچھ رہے تھے کر کچھ رہے تھے۔ موٹے موٹے شیشے کی عینک کے پیچھے بڑی اداس آنکھیں تھیں۔ اب اسپتال میں ابلا ہوا کھانا کھانا پڑے گا۔ اچھا بی بی خدا حافظ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اوہو اوہوں کرتے ہوئے کھانستے رہے' اچھا بھئی چلے اب گھر۔

آپ نے گھر اطلاع دے دی ہے۔؟

نہیں بھئی نہیں کسی کو نہیں بتانا۔ ایک دم وہ گھبرائے۔ میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی۔ باتیں چھپانے کے بادشاہ تھے۔ لاہور کی ادبی صحبتوں کے نقشے کھینچ رہے ہیں۔ پھر ایک دم غائب۔ اچھا

پھر کیا ہوا، بتائیں نا۔۔ مگر وہیں سے بات کا رخ بدل دیتے۔ کچھ پردہ نشینوں کے نام جو آجاتے تھے۔ سریندر اور فہمیدہ کی میز پر بی بی سی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ پدما کا ذکر آگیا۔ ہاں بھئی سحاب کہاں ہے ہم بھی ملیں گے۔ بچوں جیسی خوشی چہرے سے پھٹی پڑتی۔ میں نے بھی انہیں نہیں بتایا کہ آل حسن کے نام آپ کا خط آیا تھا۔ ان کی نظم سننے کے بعد جو آل حسن بھائی نے مجھے پڑھایا تھا۔ ایسے ہی سریندر سے خوب ٹیلیفون پر بات کرتے اور مجھے پوچھتے یار کیا حال ہے تمہاری سریندر کا، اور میں بھی گول کر جاتی۔ اس دن پدما نے ٹیلیفون کیا۔ آپا آپ بھی کافی ہاؤس آرہی ہیں انشا بھائی کے ساتھ۔ نہیں میں ڈیوٹی پر ہوں۔ اور مجھے پتہ تھا کہ انشا بھائی ٹیلیفون کر کے گئے تھے۔ سحاب مجھے کام سے باہر جانا ہے میرا کوئی ٹیلیفون آئے تو پیغام لے لینا۔ پھر آپریشن سے پہلے کئی دفعہ ٹیلیفون کرتے رہے مگر سوائے آپریشن کی گھبراہٹ کے دنیا جہاں کی مہوشوں کی باتیں کرتے رہے۔ تم مجھے کھانا ضرور لے کر آنا۔ لندن سے باہر سٹن سے بھی دور اسپتال ڈھونڈتی پھر رہی تھی تو ایک انگریز نے بتایا کہ افوہ یہ تو کینسر کا اسپتال ہے یہ صرف ایک ہی اسپتال ہے اور پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ انشا بھائی کتنے باہمت ہیں۔ بیوی بچوں اور بھائی بہنوں کو بتائے بغیر آپریشن کرا بیٹھے۔ پھر اسپتال میں مجھے چھوڑنے باہر تک آئے تو مجھے انہیں یاد دلانا پڑا۔ آپریشن میرا نہیں آپ کا ہوا ہے۔

اور سچ مچ عید کے دن قدرت اللہ شہاب، ڈاکٹر اجمل، انشا بھائی، بچے اور میں اسی بس اسٹاپ پر رات کو کھڑے تھے۔

فریدہ نذیر بھائی کے گھر ڈنر تھا۔ بس آئی اور یہ بچے کو گود میں لئے غلط بس میں چڑھ گئے اور چیخ رہے تھے۔ ارے بھئی روکو ٹھہرو، سواریاں اور بھی ہیں اور بس ان کو اور بچے کو لے کر چلی جا رہی تھی۔ انگریز کنڈیکٹر کا کھلا منہ ہم کو دور تک نظر آرہا تھا۔ ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ عید کا دن اور ہم سب کے ساتھ وہ بالکل بھول گئے کہ وہ لندن میں ہیں۔ کیسی سادگی لئے یہ شخص پیدا ہوا تھا، ہمدرد اتنے کہ ہر ایک کی مدد کرنے کو تیار۔ مہمان نواز اتنے کہ عید کی نماز کے بعد ہم سب جب ان کے گھر پہنچے تو پہلے ہی سے لوگ جمع تھے۔ کشور ناہید کے میاں اور مصلح الدین انشا بھائی کی فلم بنانے آئے تھے۔ کیا ان سب کو معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی چلے جائیں گے۔ صرف مجھے اور بھابھی کو معلوم نہیں تھا اور اسی دن جنازے کے پاس سوگوار بھابھی نے جب مجھے دیکھا تو چیخ پڑی۔ سحاب تو نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ یہ جلدی چلے جائیں گے یہ مہمان۔ تم سب نے مجھ سے

چھپایا اور لندن کی اسی ٹھنڈی گیلی بھیگی سڑک پر گلوسٹر روڈ پر مڑتی ہوئی اس بس سے بھاگنے کو جی چاہ رہا ہے۔ یہ انشا کا گھر ہے۔ وہ سب کہاں چلے گئے۔ وہ سب کہاں چلے گئے۔ بھرا گھر کیسا اداس ہے جہاں گھنٹی کے نیچے ایک نام لکھا تھا۔ انشا۔ جولسٹن کینسر ہسپتال کا کلرڈ پیشنٹ تھا۔

سنا ہے کلرڈ پیشن مرنے سے پہلے رات بھر خط لکھتا رہا اور پھاڑ دیتا تھا۔ بھابھی کے ہونٹ سی دئے گئے تھے۔ "قبلہ و کعبہ" جناب لکھے ہوئے ورق ملے بستر کے پاس اور گورنمنٹ کا خط آپ جلد سے جلد واپس ملک آجائیں۔ گورنمنٹ موجودہ اب اخراجات نہیں ادا کر سکتی۔ آپریشن کے بعد علاج بہت ضروری تھا لندن میں اور یہ گھبرا گھبرا کر ضیاء الحق کو خط لکھ رہے تھے۔ غصہ اور رنج۔ دو حکومتوں کی بچوں جیسی لڑائی میں ایک اچھا لکھنے والا ہمیشہ کے لئے اٹھالیا گیا۔ سنا ہے حکومت کو بہت دیر میں اس کا اندازہ ہوا اور ضیاء الحق صاحب انشا کی بیوہ کے پاس گھر تشریف لے گئے تھے۔۔

شعلہ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

"لیس اپ سیٹرز، ففتھ فلور بیڈ ٹو" ریشپسنٹ، نیلی کنجی لگی آنکھوں والی خاتون نے رجسٹر پر گیسٹ نمبرا۔ لال پنسل کا نشان لگایا اور چہرے پر پرانی مسکراہٹ سجا کر دوسرے مہمانوں کا استقبال کرنے لگی۔ لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی سفید براق یونی فارم میں ہنستی بولتی گڑیا نرس بھاگی بھاگی آئی!

"آر یو مسٹر انشاز گیسٹ، پلیز دس وے، پلیز گیو می ہز فوڈ۔ آئی ال کیپ اٹ ان فرج!" تھینک یو۔ تھینک یو۔ دو تھینک یو آپس میں ٹکرانے بھی نہ پائے تھے کہ انشا بھائی ڈریسنگ گاؤن کے بغیر، براؤن شلوار قمیص پہنے ایک ہاتھ سے قمیص کا دامن اور پیٹ پکڑے اور دوسرا کمزور سا ہاتھ دور سے پھیلائے کوریڈور تک چلے آئے۔۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کوریڈور کی چمکیلی زمین پر اسکیٹ "کرتے ہوئے مجھ تک پہنچ جائیں۔

"آؤ بھئی آؤ!" وہ ہاتھ اسی طرح بڑھاتے چلے آرہے تھے۔ "کتنی دیر کردی، دس بجے فون کیا تھا کہ کھانا لارہی ہو، اب تین بجے پہنچی ہو، واہ بھئی واہ! یہاں تو ۱۲ بجے ہی پھیکا ابلا ہوا کھانا زہر مار کر لیا" انہوں نے برتن کھول کر اس میں سے پکوڑیاں نکال کر کھانی شروع کردیں۔ "آج گیارہ دن کے بعد تمہارا نمک کھا رہا ہوں۔ یار اپنے کھانوں کی تو مدح لکھنی چاہئے۔ چلو اسے فرج میں رکھوا

دوں"۔ اور تھیلا اٹھا' براؤن سلیپر سٹرپٹر گھسیٹتے ہوئے اسی طرح ایک ہاتھ پیٹ پر رکھے' شلوار اڑسے یہ جاوہ جا۔ کمرے کے باہر۔ "آپریشن کے چار ہی دن بعد تمہارے ملک کا مریض ایسی پھرتی سے چلا کرتا ہے"؟ ناک میں نلکی لگے' بڈھے انگریز مریض نے مجھ سے اپنی ادھ کھلی آنکھ سے سوال کیا اور میرا جی چاہا کہ اپنی دوسری آنکھ بند کر کے کہوں۔ "نئیں ریساں جے ساڈے پاکستان ویاں۔"

"یہ کلرڈ مریض ایسا ہی سرپھرا ہے، جس کی تلی کے بھی کچھ حصے کو کاٹ دیا گیا ہے۔"

"کیا یہ معجزہ نہیں؟" اسی انگریز مریض نے آہستہ سے غنودگی کے لہجے میں مجھ سے بات کی جو لال کمبل اوڑھے' ہاتھ پھیلائے لیٹا تھا۔ الٹی لٹکی ہوئی بوتل سے قطرہ قطرہ گلوکوز اس کی نیلی رگیں چوس رہی تھیں۔ کیا خبر یہ انگریزوں کے آپریشن کا معجزہ ہے یا اس کلرڈ پیشنٹ کی ول پاور!

"یس یس" وہ ہکلاتے ہوئے کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ کھانسی اور اچھو نے اسے بیر بہوٹی بنا دیا جو کچھ دیر پہلے مری ہوئی مرغی کی کھال چہرے پر چڑھائے مردہ لگ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ وارڈ کے سارے مریضوں کو چیخ کر بتادوں کہ یہ میرے ملک کا شاعر اور ادیب ہے اس کے کالم پڑھنے کے لئے لوگ بے تاب رہتے ہیں۔ تم لوگ اسے کلرڈ مت کہو۔۔۔ اس کے پاس تو اب ارادوں کے اسکیچ۔۔ سلیپر رہ گئے ہیں جو یہ پہن کر دن رات تیزی سے بھاگتا جارہا ہے۔ اس کا رشتہ بے چین روح سے ہے۔ اس کی ہمت کی داد دو۔ اس نے اپنے عزیزوں کے بغیر اتنا بڑا آپریشن کروا ڈالا خاموشی سے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہاں کے ڈاکٹروں کا کیا کہنا' وہ تو جناب آپ کا سینہ چاک کرنے سے پہلے ہی بتادیتے ہیں کہ اگر آپ کا دل کاٹ پیٹ کر جوڑا گیا تو صرف چانس ہی ہے' اگر جی گئے تو آپ کی خوش قسمتی' اس کاغذ پر یہ لکھ کر دستخط کردیجئے۔ ایسے عالم میں اچھے اچھے مضبوط قویٰ کے انسانوں کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ انشا نے یہ سب کچھ سنا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر آپریشن کرا لیا۔

"یہ بہت پیارا انسان ہے۔" مرغی کی کھال چہرے پر چڑھائے انشا کا ساتھی مریض نارمل ہو چکا تھا اور مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تم اس کی پہلی مہمان ہو۔ جب سے ان کا آپریشن ہوا سب سے بڑا پھولوں کا بوکے آیا تھا۔ کینسر کے مریضوں میں بہت پاپولر ہوگا۔ ان مریضوں کے کچھ دن ہی اچھے گزرتے ہیں' روز کون ان کو دیکھنے آتا ہے۔ یہ جگہ شہر سے بہت دور ہے یہ عجیب آدمی ہے اکثر لکھتا رہتا ہے' میں تو ہل بھی نہیں سکتا۔ ایک دوزخ کی آگ میرے پیٹ میں بھری ہوئی ہے۔ اوہ

خدا! وہ چپ چاپ سو گیا یا پھر دوزخ کے دروازے اس پر کھل گئے تھے۔ اور میں اس جنت اور دوزخ دونوں کے تصور سے کانپ رہی تھی۔

"اچھا بھئی، ہوں اوں۔" وہ اکھڑے سانسوں کو ڈھیلے کرتے کی سلوٹوں میں چھپا رہے تھے۔

"بتاؤ کیا ہوا؟" کیا رستہ بھول گئی تھیں" پلنگ پر آہستہ سے بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر ذرا مڑ کے بیٹھے، پیشاب کی تھیلی کرتے کے نیچے بندھی ہوئی تھی، اسے چھپانے لگے۔ میں نے نظریں بچالیں۔ ان کے چہرے کی اداسی دکھ دے رہی تھی۔۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ دل کھول کر مجھے بتادیں کہ کیسے آپریشن ہوا، کتنی تکلیف انہیں برداشت کرنی پڑی۔ مگر وہ تو سدا کے خاموش تکلیف چھپانے والے تھے، آنکھوں کے آگے فوراً پردے کھینچ دیتے تھے۔ "ارے بھئی بتاتیں کیوں نہیں" کتنی مزے دار پکوڑیاں بنائی ہیں، مگر بہت دیر میں لائیں!"

"جی اس میں قصور میرا نہیں ہے۔ جو بس آپ نے بتائی تھی، ریل سے اترنے کے بعد، وہ چھٹی کے دن چلتی ہی نہیں! کئی گھنٹے کے بعد جب انتظار کر کے تھک چکی تھی، ایک انگریز سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ آج چھٹی ہے، بس نہیں چلے گی۔ میں اس طرف تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ میں شکریہ ادا کر کے اس کی گاڑی میں بیٹھ تو گئی لیکن اس راستے میں جب باغ ختم ہونے ہی میں نہیں آئے تو میں خاصی ڈری۔

"اچھا اچھا ہمارے بہانے انگریز کی کار میں آئی ہو، خوب بھئی خوب!" وہ سچ مچ خوش ہو گئے اور شرارت ان کی آنکھوں میں چھلک رہی تھی۔ سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے "پھر کتنی دیر اس کی گاڑی میں گھومتی رہیں"؟ "ارے نہیں انشا بھائی! نہیں بھئی یہ کینسر اسپتال ہی اتنی دور بنایا گیا ہے"۔ اور بغیر سوچے سمجھے میرے منہ سے نکل گیا۔ ان کے چہرے پر زردی جب زیادہ بڑھنے لگی تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ایسی ہی زردی اس سے پہلے بی بی سی کی کینٹین کی مدھم روشنیوں میں ان کے چہرے پر نظر آئی تھی جب وہ پاکستان سے آئے ہوئے تھے اور ہم میں سے کسی کو اس کا علم نہ تھا۔۔۔ اور وسیم صدیقی نے کیو میں لگے مجھے بتایا تھا کہ یہ اپنا علاج کرانے آئے ہیں۔ ان کو کینسر ہے، ایمبیسی میں کچھ کام کریں گے اور اس طرح علاج مفت ہو سکے گا کینسر کا۔ میں چائے لے رہا ہوں تم کھانا لے لو۔

"آپ تو بھوکے ہوں گے، انشا بھائی!" چہرہ اتر گیا۔

"وسیم اس دفعہ بھی پیسے بچا گئے۔" حبیب نے فقرہ کسا جو خود بدنام کینٹین تھے۔ کاظمی بھائی،

ناہید، شاہ صاحب سب ہنس پڑے۔ "بھائی لوگو یہ بھائی بنا گئی نا۔ تم نے مجھے بھائی کس سلسلے میں بنایا سحاب؟"۔ "اچھا سنئے آپ کی ریکارڈنگ بڑی خراب تھی، آپ بولتے ذرا بھی اچھا نہیں۔ کتنا اچھا کہتے ہیں مگر انشا سب کے ساتھ ہنستے تو تھے لیکن چپکے سے غائب ہو جاتے۔ میرے اندر سے اچھی خاتون نے کہا "اس کے چہرے پر اطمینان تو ہے وسیم تو ایسا ہی لپاڑیا ہے۔ یوں ہی اڑادی"۔ اور میں نے جھٹ سے پوچھ ہی لیا۔ "انشا بھائی آپ علاج کے لئے آئے ہیں نا؟! ایمبیسی میں اسی لئے کام کریں گے کہ آپریشن کے لئے سہولت ہو جائے"۔ "نہیں نہیں کون کہتا ہے کون؟" ۔۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئے۔ پھر کانٹے سے چیز اور قیمے کا جگر چیرتے رہے اور کچھ نہ کھایا۔ میز پر سب کے کانٹے چھریوں نے شور برپا کر دیا۔ وسیم کو فوراً کام یاد آ گیا۔ ناہید کو برمنگھم کی ٹرین کا وقت یاد آیا اور ہم چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ آخر انہوں نے خاموشی کو خود ہی توڑا۔ "بھئی میں تو انڈیا آفس لائبریری میں کام کرنے آیا ہوں اور ایمبیسی میں منسٹر ہو کر آیا ہوں۔ لیکن یہ آخر کس نے اڑادی"۔ "انشا بھائی ہو سکتا ہے میں نے کسی اور کے بارے میں سنا ہو"۔ میں نے جھوٹ بولا جو میری آواز کو بدصورت کر رہا تھا۔ انہوں نے بغیر میری طرف نگاہ کئے کہا "بھٹو صاحب نے حکم دیا کہ پرانے مسودے دیکھو میں تو ریسرچ کرنے آیا ہوں۔ منسٹر کا عہدہ بھی عنایت کیا ہے اور ایک پی اے اور ایک اسٹینو بھی ملے گا"۔ وہ بچوں کی طرح کہانی سناتے رہے تھے۔ ایئرپورٹ پر آپ کو کوئی لینے نہیں گیا تھا۔ "مجھے معلوم ہو جاتا" میں بھی ایمبیسی میں کام کرتی ہوں! میری اوچھی عورت اندر سے بہت خوش ہوئی۔۔ "نہیں! نذیر ایجوکیشن اٹیچی آئے تھے مجھے لینے۔" "تو آپ ان کے گھر میں ٹھہرے ہیں۔" میں نے سارا راز اگل دیا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟" "بھئی فریدہ میری دوست ہے۔ نذیر بھائی بھی میرے بڑے پیارے دوست ہیں"۔ "اچھا اچھا اب دیکھو بی بی بچوں سے الگ ہوں، گھر بار وطن سے دور، گھر کا ملنا تو آسان نہیں معلوم نہیں کتنے دن نذیر کے گھر رہوں"۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ یہیں کہیں کوئی کمرا ملتا تو لنچ اور ڈنر کا آرام ہو جاتا کہ بی بی سی میں یہ چیزیں بڑی سستی ملتی ہیں۔"

انشا کسی کی تکلیف دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کا اسپتال لندن سے باہر بہت دور تھا۔ آنے جانے کے لئے تین پونڈ کرایہ لگتا تھا اور یوں اچھے اچھے لوگ بھاگ جاتے۔ مگر اسپتال کا انگریزی کھانا ان کو پسند نہ تھا، اس لئے وہ کسی قدر اصرار کے ساتھ مان جاتے۔ میں نے ایک دن فون کیا اور انہیں بتایا کہ آج جب آپ کا پی اے آئے گا تو میں کھانا کینٹین سے آپ کے لئے پاکستانی کھانے بھجواؤں

انشاجی کی آخری تصویر
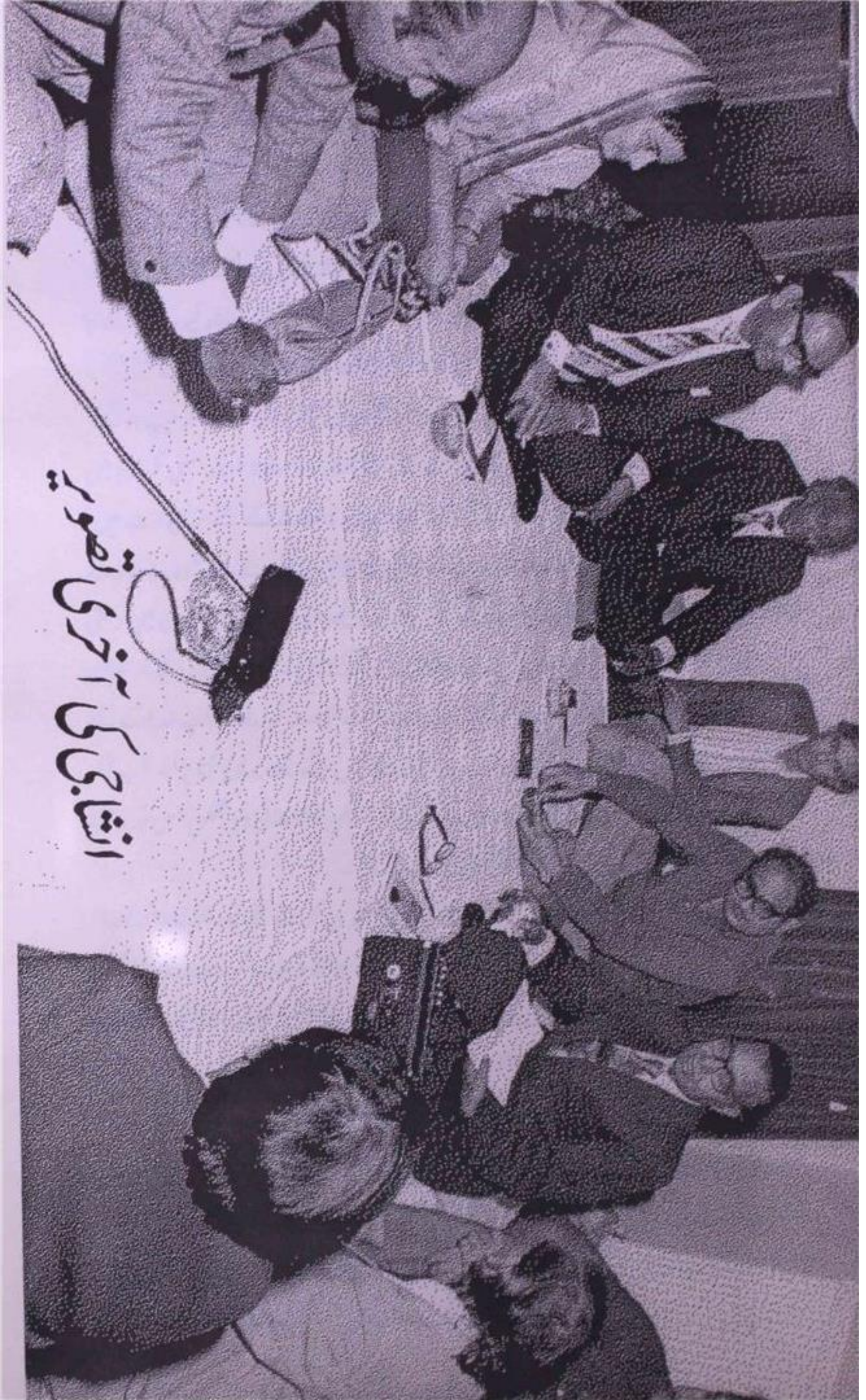
گی۔ ان کے نئے دفتر میں دو آدمیوں کا اسٹاف تھا۔ ان میں سے ایک صاحب داڑھی والے، شرعی پاجامہ اور شیروانی ڈاٹے رہتے تھے۔ میں نے ان سے لجاجت سے کہا، انشا صاحب کو دو دن سے پاکستانی کھانا نہیں دستیاب ہو سکا۔ آپ آج جائیں تو مہربانی کر کے یہ کھانا بھی ساتھ لیتے جائیں اور یہ پیسے بھی رکھ لیجئے۔ ان کا پتا میں لکھے دیتی ہوں۔ انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے چمک کر کہا "جی مجھے تو راستہ ہی نہیں معلوم۔ پھر دیکھئے نا میں ان کا اسٹینو ہوں، میں کھانا وغیرہ نہیں لے جا سکتا، مجھے رسالے لے جانے ہیں، وہ لے جاؤں گا۔ بشرطیکہ مجھے کوئی ٹھیک راستہ بتا دے"۔

دوسرے دن میں جب گئی تو انشا سے میں نے یہ واقعہ بھی بیان کیا تو وہ ہونٹ لٹکا کر چپ ہو گئے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مجھے غصہ بہت تھا میں نے کہا، انشا بھائی وہ مولانا ضرور سہی مگر ان میں انسانیت بالکل نہیں۔ ان کو جب یہ بھی بتایا گیا کہ آپ پسندیدہ کھانے کے لئے ترس رہے ہیں، کیسے مسلمان ہیں انہیں ذرا رحم بھی نہ آیا۔۔۔ وہ میری تیز کلامی پر ہلکے سے ہنسے "وہ بے چارے راستہ ہی نہیں ڈھونڈ سکے، سحاب وہ سیدھے آدمی ہیں۔ دیکھو ان کی بیٹی یہاں لندن میں رہتی ہیں۔ مجھے معلوم بھی نہ تھا، کسی سفارش سے وہ خود یہاں آگئے ہیں۔ میں تو انہیں دیکھ کر حیران بھی ہوا کہ اپنے آپ یہ آخر کس طرح آگئے۔ سو وہ لگے منت سماجت کرنے کہ آپ خدا کے لئے اعتراض نہ کیجئے گا۔ میری بیٹی یہاں ہے اور وہ اکیلی ہے، اس لئے مجھے یہاں آنا پڑا۔ آپ اگر اعتراض کریں گے تو میرے لئے مصیبت بن جائے گی۔ "لیکن انشا بھائی وہ شخص اس قدر بے مروت بن گیا کہ اپنے محسن کے لئے کھانا اسپتال نہ لے جا سکا"۔

کھانے کے لئے میرے پیسے ادا کرنے کو انشا بھائی ہمیشہ محسوس کرتے تھے اور خوشامدانہ انداز میں کہا کرتے۔ "ارے بھئی سحاب یہ نہ ہو گا۔ میں تم سے بڑا ہوں اور تم سے زیادہ کماتا بھی ہوں۔ تم مجھ سے پیسے لے لو۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، میرے لئے اتنی تکلیف اٹھاتی ہو، مجھے اس سے بڑا دکھ ہوتا ہے"۔ میں ہنس کر کہتی "اچھا بابا اکٹھے دے دینا"۔

ایک صاحبہ کے ہاں ہم لوگ کھانے پر مدعو تھے۔ بڑی بور پارٹی تھی کہنے لگے، یار نذیر دیکھو سحاب کی ان سے کیسی دوستی ہے؟ انہوں نے سن لیا اور فوراً بولیں "ہاں انشا بھائی آخر سحاب میں کیا ہے جو مجھ سے دوستی نہیں ہو سکتی؟ میں ڈر گئی کیونکہ وہ بہت لڑاکا تھیں۔ خالد نے گھبرا کر گلاس میں زیادہ شراب انڈیل لی مگر یہ اسی طرح دھیمے لہجے میں مسکرا کر بولے۔ "بھائی دیکھئے سحاب اتنے اچھے کباب ہرگز نہیں پکا سکتی، اگر دوبارہ جنم لے لے تب بھی"۔ سب ہنس پڑے۔ وہ اپنے سہج

انداز میں طوفان پی گئے، چپکے چپکے اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ اسی طرح ایک رات فریدہ اور نظیر بھائی کے گھر ہم سب جمع تھے۔ میز پر کھانے چنے ہوئے تھے لیکن پاکستان کے حالات سے سبھی کو تشویش تھی ہم سب ٹی وی اور ریڈیو پر خبریں سننے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ خالد بار بار فون کر کے بیوی سے پاکستان کی خبریں پوچھ رہے تھے۔ دولتانہ صاحب فیض صاحب سے تھوڑی دیر کے بعد فون پر باتیں کرتے تھے، ہم سب کے دلوں میں پاکستان دھڑک رہا تھا۔

انشا نذیر بھائی اور فریدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خالد حسن نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے گلاس میں کئی برف کے ٹکڑے گھبراہٹ میں ڈال لئے۔ سامنے صوفے پر بجی سفارت خانے کے افسران کی بیویوں نے اپنے پہلو بدلے اور دوسرے پوز بنا کر فیض صاحب کی دوسری نظم کے لئے تیار ہو گئیں۔ کئی ایک نے کن انکھیوں سے اپنے اپنے میاؤں کی نظروں کا ٹارگیٹ دیکھ کر نئے بنائے ہوئے بال درست کئے جو پندرہ بیس پاؤنڈ خرچ کر کے بیوٹی پارلر سے بنوائے گئے تھے۔ فیض صاحب نے نئی نظم "الیکشن" سنائی۔ پاکستان کا نقشہ کھنچ گیا۔ ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہمارے پیار کا اظہار ابھی تک اس روایت سے ہوتا ہے۔ باہر رہ کر اپنا ملک کتنا عزیز ہوتا ہے۔ یہ اس محفل کی موتیوں بھری آنکھوں کو معلوم تھا۔ یا صرف وہی لوگ جانتے ہیں جنہیں دیارِ غیر میں رہنا پڑتا ہے۔

"ہمارے ملک میں لوگ مرنے کے بعد کیوں سوگ مناتے ہیں، ہیں جی فیض صاحب" نہایت عمدہ سونے کی گھڑی پہننے والے تاجر مہمانوں نے دو گلاس بھرے اور برف کی ٹھنڈک حلق میں اتارنے لگے۔ "آج انشا جی ضرور سنائیں گے"۔ وہ سب چیخ رہے تھے۔ "لوگو کچھ خیال کرو۔ پرسوں میرا آپریشن ہے آج نظم سناؤں؟ اوہو اوہو" وہ اپنی مخصوص تھکی ہوئی ہنسی سے بولتے بولتے صوفے میں گھس گئے۔ رومال سے منہ پونچھ کر سارے جسم کو ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں اپنے ہاتھوں سے سنبھال کر محسوس کر رہے تھے جیسے جسم تو ان کے ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ ایسا کرتے تھے، پھر اطمینان سے سارا سراپا وہیں ملتا تو گھبراہٹ سے انگلیاں سوکھے، رنگ اڑے ہونٹوں پر رکھ لیتے تھے جن کا خون کب کا نچڑا ہوا تھا۔ جیسے کچھ کھوج کر ان کی سوچ لا رہی ہے۔ خزانوں کا پتا جوان کے موٹے موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے چھپا رکھا ہو۔ خالد حسن، فیض صاحب، نذیر بھائی پر ایک دم ٹیلیفون کی گھنٹی نے کیا جادو کیا کہ وہ اپنے گلاس منٹوں میں ختم کر گئے۔ سوچ کے ساتھ ان کی پیشانیاں بھی شبنمی قطروں سے نہا رہی تھیں۔ نہ جانے دولتانہ صاحب نے کیا کہا تھا۔ "یار جنگ نہ

رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' وہ بس ایک شاعرہ ہیں اور ہندوستان سے آئی ہیں اور پھر ہم ہائیڈ پارک کے لئے ایک کونے میں سارے کے سارے اندھیرا ہونے تک بیٹھے رہتے۔ وہ ایک عورت سے دوسری عورت کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ جب میں نے پدما' فہمیدہ اور سریندر کی تعریف کی تو ایسی معصومیت سے بولے کون سریندر! اور میں حیران رہ گئی۔ ہائے انشا بھائی آپ سریندر کو بھول گئے۔ ماتا ہری!

کون ماتا ہری؟ وہ چونکے بے تعلق سے "سریندر کوچر"۔ "اچھا اچھا کوچر۔ کسی سے شادی ہو گئی"۔ ذرا مسکرائے "جی انشاجی! اب کے ان کے کانٹے میں ایک بے روزگار جرنلسٹ کا گوشت ہے" وسیم صدیقی نے اپنی طرف سے فقرہ کسا اور قہقہوں کے شور پر بی بی سی کنٹین کے غیر ملکی چہروں نے ایک بار ہماری میزوں پر نظر ڈالی۔ انشا کا چہرہ نیم تاریکی میں زیادہ سیاہی سے چمک رہا تھا' انہوں نے بات کا رخ خوب صورتی سے بدل دیا۔ "ہال میں دنیا کی کتنی قومیں جمع ہیں' سب اپنے اپنے حلقوں میں خوش ہیں۔ سوائے ہماری قوم کے کہ ایک میز پر ہم سب نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ پاکستانی جوڑا ہمیشہ آٹھ نو میزیں چھوڑ کر بیٹھتا ہے"۔ میں نے راشد اشرف اور شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں یار سحاب یہ یہاں بھی چلتا ہے ایسا ویسا۔ یہ کون صاحب ہیں"۔ وہ شمیم اور راشد اشرف کو رشک سے دیکھ رہے تھے "یار تم لوگ مزے میں ہو۔ میں ہمیشہ بی بی سی کی کنٹین سے فیسی نیٹ ہوتا ہوں۔ یہ فرنگنیں گھاس نہیں ڈالتیں"۔ وہ للچائی اداسی سے سب کو دیکھ رہے تھے۔ انہی کا مقولہ تو ہے کہ پڑوسیوں کا لان بڑا ہرا نظر آتا ہے۔ حبیب نے بھی فقرہ کس دیا مگر ہم تو ساون کے اندھے ہیں۔ "کنجوس لوگ خوب قہقہے لگا رہے ہیں"۔ وسیم نے حبیب پر فقرہ کسا "چلو یار چلیں" انشا ڈر گئے کہ کہیں جھگڑا نہ ہو جائے۔

"کل بیوی بچے آرہے ہیں ابھی تار آیا ہے۔" وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ "سحاب میرے دو بیٹے ہیں رومی اور سعدی۔ یہ دونوں بچے بہت پیارے ہیں۔ چھوٹا تو بہت شریر ہے"۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ پہلی بار آج اپنے کواڑوں کی جھری کھولی پھر کسی کو ٹیلیفون پر بتاتے رہے۔ "ایئر پورٹ جانا وقت سے پہلے کہیں میرا بھائی اور بچے آکر کھڑے رہیں۔ انہیں پریشانی نہ ہو! ہاں میرا بھائی ریاض۔ ارے یار پھر کیسے پہچانو گے؟ سنو میری بیوی کے بال سحاب کے بالوں جیسے ہیں۔ ہاں سحاب سے لمبی ہے"۔ اور دوسری طرف کے فقرے کو ہنسی میں چھپا گئے۔ "دو بچے بھی ہوں گے" وہ کون تھے نہ میں نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا۔ میرا حلیہ ضرور

چھڑ جائے" "یار یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں" اور ادھر انشا کہنے لگے "فریدہ کھانا خوب تھا" انشا نے جنگ اخبار سے انگلیوں کا گھی پونچھا۔ "ارے یہ میرا آج کا کالم تھا"۔ "انشا بھائی اوہو اوہو"۔ "تم لکھتی رہو تو اچھا لکھ لوگی زبان تو گھر کی لونڈی ہے"۔ وہ ہنسے "کچھ کہہ لیں آپ اچھے براڈ کاسٹر کبھی نہیں ہو سکتے۔ بڑا خراب بولتے ہیں۔ کالم آپ اچھا لکھتے ہیں۔ مان لیتے ہیں۔ آپ کے کالم جب تک نہیں پڑھے تھے آپ سے بڑی خفا تھی۔ آتے ہیں بی بی سی ڈونیشن کے ساتھ۔ رائٹر اور کوئی نہیں ملتا پاکستان کو؟ کتنا خراب بولتے ہیں۔ میں فہمیدہ اور سریندر سے کئی دفعہ آپ کی وجہ سے لڑی مگر جب ایک روز آپ کا کالم پڑھا' پھر "اردو کی آخری کتاب"۔۔ پھر تو اخبار میں انشا کا نام دیکھا اور کھڑے کھڑے پڑھ لیا۔ حد تو یہ کہ کتابوں کا ریویو تک غضب کا ہوتا تھا۔ اتنے دور بیٹھے گھر والوں سے بھی فرمائش ہوتی تھی' مٹھائی نہیں چاہئے' کوئی بھی نیا رسالہ اور کتابیں بھجوائیں۔ انشا کے آنے سے ایمبیسی میں جیسے عید ہو گئی ہو۔

صبح سے شام تک لوگوں کو پتے بتاتے' ٹیلیفون پر بکواس کرتے' چپراسیوں اور ڈرائیوروں سے جھک جھک کرتے۔ آرمی' نیوی' ایئر فورس کے سگریٹ اور شراب کے کارٹن پروٹو کول ڈلیوریز کو نکلواتے شام ہو جاتی تھی۔ نذیر اور انشا کی وجہ سے ایمبیسی میں میرے تو کئی مہینے سنور گئے۔ جیسے ادبی ٹھرک سے جینے میں لذت آگئی ہو۔ خالد حسن (پریس کونسلر) اور فیض صاحب کسی فلم کا بیڑا غرق کرنے گئے ہوئے تھے لندن سے باہر اور غضب یہ کہ قدرت اللہ شہاب اور ڈاکٹر اجمل (اختر کے میاں) بھی آگئے۔ نذیر کی بیوی فریدہ جو ممتاز مفتی کی بہن کی لڑکی تھی' وہ اور ان کے میاں ایجوکیشن کونسلر بن کر آئے ہوئے تھے۔ اور ادھر پدما سچ دیو (ڈوگری کی شاعرہ) بمبئی سے آگئی تھی۔ گویا لندن میں بہار آگئی ہو' انشا' شہاب' میں سب ہی ان کے عاشق زار تھے۔ خوبصورت کالے بال' کالی آنکھوں والی معصوم سی شکل کی۔ میدے سے گندھی ہوئی شرمائی شرمائی پوتر' شہد بھری آواز سے فائدہ اٹھانے والی پدما سچ دیو۔ ہم روز خوب ملتے۔ پدما کی ڈوگری نظمیں بی بی سی سے نشر ہونے کے بعد تین صفحے کا خط انشا نے آل حسن کو بی بی سی کے نام بھیجا تھا جس کا اردو ترجمہ میں نے کیا۔ کچھ یوں تھا کہ پدما کی تعریف کے پل' پھر ان کے حلئے کی ساری ڈیٹیل' شادی ہوئی یا نہیں۔ اسے پڑھ کر ان کے ٹھرکی پن پر ہم سب ہنستے رہے۔

شہاب بھائی اور ڈاکٹر اجمل کو میں نے یہ قصہ بھی بی بی سی کنٹین میں سنایا تھا مگر انشا بھائی کو نہیں معلوم تھا کہ بی بی سی میں یہ سب کو معلوم ہو چکا ہے' اس شام وہ پدما سے ہنس ہنس کے ایسے مل

بتاتے رہے۔ چھپا کے بات کرنے سے شاید انہیں روحانی خوشی ہوتی تھی۔ جو بات نہ بتانی ہوتی وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال جاتے۔ فوراً بات کا رخ پلٹ دیتے تھے۔ لوگوں کے کام بھی چپکے سے کر دیتے تھے۔ محمود خان مودی کا کتنا خیال کیا۔ اس کی نوکری کے لئے ہر ایک سے کہتے مگر زبان پر نہ لاتے اور چپکے چپکے سفارش کرتے رہے۔ وہ تو سومرو صاحب نے ایمبیسی میں ان کی پیٹھ ٹھونک کر سب کے سامنے یہ راز فاش کر دیا۔ "انشاجی یہ ایمبیسی کی نوکریاں منسٹری سے بغیر پوچھے نہیں حاصل کی جا سکتیں۔ بادشاہ ہو! آپ کس طرح محمود خان کو اپنا سیکریٹری رکھ سکتے ہیں۔ ابھی آپ کے بیٹھنے کے لئے کمرے تک کا بندوبست تو ہوا نہیں۔ آپ ایجوکیشن کے کمروں میں سے ایک کمرہ منتخب کر لیں"۔

ان کو ارمان ہی رہا کہ ایمبیسی میں انہیں بھی بڑا سا کمرہ ملتا جس کے باہر منسٹر کا بورڈ لگا ہوتا۔ انہوں نے آخر ایک دن ہنستے ہوئے کہہ ہی دیا۔ "بی بی شاعروں ادیبوں کا کوئی قصور نہیں۔ اقتدار میں بڑا حسن ہے"۔

اور آج یہ ادیب' یہ کلرڈ پیشنٹ چپ چاپ کتھئی شلوار قمیص پہنے سٹریچر کرتا ہوا ٹیلیفون پر نثار قربان ہوتا پھر رہا تھا اور اپنے خاندان کے لئے کیسا بے تاب تھا۔ دوبارہ زندگی کی امید پر' اطمینان پر' کیسے ساری قوت ارادی کتنے زور شور سے واپس آگئی تھی۔ اور میں چپ چاپ دیکھتی رہی۔

ناک میں نلکی لگا آدھا بیٹھا آدھا لیٹا انگریز جو نہ سو سکتا تھا نہ جاگ رہا تھا' اس کے چھلکے جیسے سینے میں سانس اس طرح تھا جیسے سرکش بچہ راستہ نہ ملنے پر ادھر سے ادھر بے قرار بھاگ رہا ہو۔ میں دیکھتی رہی' اس کے سینے کی دھونکنی چلتی رہی اور میرا کلرڈ پیشنٹ بیوی بچوں کے پہنچنے کے انتظامات کے لئے ٹیلیفون کھڑکھڑاتا رہا۔ اور میں سوچنے لگی "کیا واقعی آپریشن انشا نے کروایا ہے"۔

آپریشن سے پہلے ان پر گھبراہٹ اور مایوسی کا دور دورہ تھا۔ میں ان کا دھیان بٹاتی اور ہمت بندھانے کی کوشش کرتی رہی۔ انشا بھائی! لندن کے ادبی حلقے میں ضرور چلئے کرشن چندر کے تعزیتی جلسے کی صدارت تو آپ ہی کو کرنی ہو گی۔

"نہیں نہیں بھئی خدا کے لئے نہیں سحاب' میں کسی جلسے میں نہ جاؤں گا' نہ میں کسی سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کالم لکھنے چھوڑ دیئے۔ میرا جی نہیں چاہتا۔۔۔ اب گھر مل گیا ہے۔ تم کسی دن آ

جاؤ۔ گھر کی کچھ چیزیں خرید لیں۔ آپریشن کے بعد دعوت کریں گے۔ وہاں سب سے ملنا ہو جائے گا۔ بھئی اگر زندگی ہے تو دیکھا جائے گا یار زندہ صحبت باقی"۔ حلقہ ارباب ذوق پر تمہارا نام تو اخبار میں نہیں چھپا"۔ "میرا ٹیلیفون نمبر تو چھپا ہے"۔ اے۔ یکھ کر مشکل سے مانے 'عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سنجیدہ آنکھیں جیسے دور کہیں کھو گئی تھیں۔ اس ملگجے لٹے ہوئے چہرے پر چمکدار رنگیں اور بھرے پرے دنوں کی بندھی پوٹلیاں کھل رہی تھیں' وہ اسی طرح عالم خیال میں گم رہے۔ پھر چونک کر بولے "کرشن ہمارا بڑا پیا تھا' تم ہی بتاؤ سلمیٰ کو کس طرح خط لکھوں"۔ پھر پہل دفعہ جلی راکھ کے پیچھے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں مجھے نظر آئیں اور اخبار کے سارے کنارے پر قلم سے "پیا" انسان کے بارے میں کچھ لکھتے رہے۔

کرشن چندر کے تعزیتی جلسہ عام میں شرکا سب جمع ہو چکے تھے۔ شام کے سات بجے بارش شروع ہو گئی' صدر جلسہ غائب' کچھ حضرات نے میرا مذاق اڑانا شروع کیا۔ "ارے بھئی کہاں ہیں صدر جلسہ۔ وہ تو ہمیشہ کے عادی ہیں' وعدہ کر لیتے ہیں۔ انتہا یہ کہ ٹیکسی تک منگوا لیتے ہیں پھر بھی نہیں آتے"۔ لیکن سب نے دیکھا انشا آئے' بارش میں بھیگتے ہوئے اور صدارت کی' رات کے گیارہ بجے تک بھوکے پیاسے رہے اور کرشن پر بڑا پیارا مضمون بھی پڑھا۔

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

میں یہ شعر نہ جانے کیوں گنگناتی رہی۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ مگر انشا کی آنکھوں میں غضب کی ویرانی تھی۔ وہ سچ مچ اداس تھے۔ اس لمحے میں نے بے اختیار ہو کر کہا' انشا بھائی آپ پاکستان ابھی ٹیلی گرام دے دیں ورنہ میں جا کر دے دیتی ہوں۔ وہ جیسے تڑپ گئے۔ "ارے نہیں بھئی خدا کے لئے نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا کہ پرسوں میرا آپریشن ہے۔ دیکھو سحاب کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے"۔ وہ گھبراتے رہے اور پورے راستے مجھے منع کرتے رہے۔

جب سے لندن آئے تھے صرف تین چار کالم ہی لکھے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی ٹال گئے۔ اخبار کے حاشے پر البتہ ضرور لکھتے رہتے۔ سب باتیں کر رہے ہیں اور یہ چپکے سے قلم نکال کر حاشے پر جلدی جلدی لکھتے جاتے ہیں جیسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی ہو۔

نائٹس برج کے قریب ہیرڈز (Harrod) ایک معروف اسٹور ہے۔ انہیں اس کا بھی اشتیاق تھا کہنے لگے "سحاب چلو ہیرڈز بھی دیکھ لیا جائے۔ ملکہ عالیہ بھی اس اسٹور سے چیزیں خریدتی ہیں"۔ میں نے کہا، سیل (Sale) کے پہلے روز سفارت خانے کے لوگ وہاں بھرے ہوتے ہیں۔ خواتین ۴۰، ۵۰ پونڈ کی شیفون کی ساڑھیاں خریدتی ہیں۔ کہنے لگے، ہاں بھئی تم تو امیر عورت ہو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔

"ارے انشا بھائی یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ میں تو سیل کے دن تولیہ، صابن ایسی چیزیں جو سیل میں سستی ہو جاتی ہیں، وہ ضرور خرید لیتی ہوں۔ میری اس خریداری کو آپ امیری کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے محنت کرتی ہوں تب اپنی ضرورت کی چیزیں میسر آتی ہیں۔ لوگوں کا یہ حال ہے کہ ہیرڈز کے تھیلوں میں ڈبل روٹیاں خریدنے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ تھیلے ان کی بیویوں کے کام آتے ہیں کیونکہ ان تھیلوں کا دوسرے لوگوں پر رعب الگ پڑتا ہے"۔ "اچھا ہیرڈز کے تھیلوں سے دیکھنے والوں پر رعب پڑتا ہے؟"

لنچ کا ایک گھنٹہ ہم ہائیڈ پارک میں اپنے اپنے سینڈوچ، جوس کے کاغذی گلاس، تھیلوں سے نکال کر پھولوں بھرے ایک کونے میں بیٹھ کر گزارتے۔ "کس سوچ میں پڑ گئیں سحاب؟" وہ مجھے کھویا کھویا دیکھ کر کہتے۔ "کچھ بھی نہیں انشا بھائی میں یہ سوچ رہی تھی، دیکھئے نا یہاں کتنا سکون ہے۔ مجھے دفتر نہ واپس جانا ہوتا تو اسی ہری ہری گھاس کی تراوٹ میں آنکھیں بند کر کے لیٹی رہتی"۔ سامنے والے جوڑے، تھوڑی دور قدرت کی فیاضی کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور انشا بھائی ان لوگوں کی بے نیازی کو مسلسل دیکھے جا رہے تھے یا پھر یوں سمجھئے کہ اتنی دور بیٹھے وہ حسرت سے تک رہے تھے۔ گویا ان کی رال ٹپک رہی تھی۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔ "انشا بھائی کچھ دن میں صبح شام ایسی فلمیں دیکھیں گے تو آپ پھر عادی ہو جائیں گے"۔ اس پر وہ جھینپ گئے۔ "نہیں بھئی میں تو کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔ ہاں مجھے یاد آیا تمہارے چہیتے مستنصر تارڑ کا خط آیا ہے"۔ پھر وہ شروع ہو گئے۔ "پروین شاکر نے بھی خط لکھا ہے اور ہاں کشور ناہید بڑی چیز ہے۔ بھئی اس سے کوئی نہیں جیت سکتا"۔ پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئے "پاکستان سے آ کر کیسے کیسے لوگ یاد آتے ہیں۔"

"ہاں انشا بھائی یہاں رہ کر یہی تو تکلیف ہوتی ہے۔ میں تو نوکری چھوڑ رہی ہوں!"

"نہیں نہیں ایسا نہ کرنا۔ مجھ سے سومرو صاحب نے ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا صاحب یہ لڑکی باؤلی

ہے 'اسے نوکری کی پروا کہاں؟ میں تمہیں ہرگز رائے نہ دوں گا۔ سومرو صاحب تمہارا بے حد خیال کرتے ہیں کہتے تھے آپ سمجھائیں جب تک میں یہاں ہوں اسے ایمبیسی کی ملازمت نہیں چھوڑنی چاہئے۔ میں ہر طرح اس کی مدد کے لئے ہمہ وقت حاضر ہوں۔ بھئی تمہارا جادو سومرو صاحب پر بھی چل گیا نا"۔ میرے دکھ بھرے آنسو خود بخود رک گئے اور وہ مجھے ہنسانے کے لئے برابر کوشاں رہے۔ میری کئی دوستوں ثمینہ 'ساجدہ' نجمہ سے ان کی بھی دوستی ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ کہتے "یار تم اپنی سب سہیلیوں کی ٹولی سمیت آیا کرو۔ لنچ Hot Pot میں کھایا کریں گے"۔ پھر سوچ کر انہوں نے پوچھا "بی بی سی سے جو تم پروگرام کرتی ہو کیا اتنے پیسے تمہیں وہاں سے نہیں مل سکتے"؟ "نہیں مجھے نہیں مل سکتے"۔ "کیوں"؟

"انشا بھائی مصیبت یہ ہے کہ پروڈیوسر صاحبان کی الٹی سیدھی باتیں میں برداشت نہیں کر سکتی"۔ "ارے نہیں بھئی تمہیں تو سب ہی جانتے ہیں اور تمہارا بہت خیال کرتے ہیں"۔ وہ دھیمے دھیمے انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ "اجی آپ کو کیا معلوم؟ پروگرام اس کو زیادہ مل سکتے ہیں جو پروڈیوسروں کی بے وقوف بیویوں سے دوستی کر کے انہیں بھی خوش رکھ سکے۔ بیویاں اپنے شوہر پروڈیوسروں کو ٹیلیفون کر کے راہیں سمجھاتی رہتی ہیں۔ اگر ان کی بیوی بی بی کو پروگرام پسند آجائے تو پروڈیوسر خوش۔ آپ بوگس اسکرپٹ کی تعریف کرتے جائیں تو وہ نہال نہال ہو جاتے ہیں"۔

"ارے بھئی وہ -- پروڈیوسر تو بڑا بیبا ہے وہ بھی تمہیں پروگرام نہیں دیتا.؟ "جی اس پروڈیوسر کی بیوی خاک اچھا نہیں لکھتی۔ یہی رائے میں نے اسے بتا دی تھی۔ بس وہ دن اور آج کا دن وہ صاحب خفا ہو گئے"۔ انگلیاں تک لرزتی ہیں ایڈیٹ بھی نہیں کر سکتے۔

"اوف فو' ارے بھئی تمہیں کس نے کہا کہ تم اپنی رائے دو۔ بھئی کمال ہے۔ اوں ہوں ہوں ہوں..." وہ ہلکے ہلکے ہنستے رہے۔ "کیا تم نے سچ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے بادشاہو! ذرا تو عقل سے کام لو"۔ پھر ان کی ہنسی جاری رہی۔

وہ جب سے لندن آئے تھے انہیں کہاں کی جلدی تھی۔ ایجنٹوں کے ٹیلیفون آ رہے ہیں۔ گھر ڈھونڈا جا رہا ہے اور مودی بھی ان کے فون سے کئی جگہ فون کر کے پوچھتے رہتے تھے مگر انشا بھائی گھبرائے گھبرائے نظر آئے تھے۔ آخر وہ دن آہی گیا جب گلوسٹر روڈ پر اسی (۸۰) پونڈ ہفتے پر گھر مل ہی گیا۔ اچانک اتنا اچھا فلیٹ لندن کے قلب میں مل جانا معجزہ تھا اور انتظامات سب اللہ میاں کر

رہے تھے۔ اور اللہ میاں ہی کو معلوم تھا کہ وہ جلد بازی اور تیاری کس لئے کر رہے ہیں۔

ان کا فلیٹ بہت اچھا تھا۔ نیچے دفتر بنایا گیا اور اوپر رہنے کے لئے پانچ کشادہ کمرے۔ فلیٹ کی گھنٹی بجاتے ہی شلوار قمیص پہنے موٹے شیشوں کی عینک لگائے انشاجی نمودار ہو جاتے تھے۔ آخر انہوں نے ہمت کر ہی ڈالی۔ ان کے زردی مائل چہرے پر زردی اور پھیل گئی تھی۔ جس دن وہ آپریشن کے لئے اسپتال میں داخل ہونے جا رہے تھے۔ ان کی حالت غیر تھی۔ ان کے ہاتھ میں رومال تھا۔ لیکن ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے ٹک جاتے تھے۔ ان کے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے بڑی اداس آنکھیں تھیں۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھے دیکھا۔ ان کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اوہوں ہوں 'اوہوں ہوں' کسی قدر کھانستے ہوئے بولے۔ "اچھابی بی سحاب خدا حافظ پھر ملیں گے اگر خدا لایا"۔ میری سمجھ میں نہیں آیا آخر انہیں کس طرح تسلی دوں۔ "انشا بھائی گھبرایئے نہیں اللہ مددگار ہے۔ آپ کو تو علم ہے ناسرخوش بھائی نے تو یہیں لندن میں اوپن ہارٹ سرجری کرائی تھی۔ اللہ نے انہیں زندگی عطا کر دی۔ آپ بھی انشاء اللہ جلد تندرست ہو جائیں گے اور میں سوچتی رہی کہ کتنا ہمدرد انسان ہے جو دوسروں کے دکھوں پر بے قرار ہو جاتا ہے۔ ہمدرد اتنے کہ ہر ایک کی مدد کے لئے فوراً تیار۔ مہمان نواز اتنے کہ عید کے دن جب ہم لوگ ان کے ہاں جمع ہوئے تو وہ خاطر کے لئے بچھے جاتے تھے۔ کشور ناہید کے میاں اور مصلح الدین انشا بھائی کی فلم بنانے آئے تھے۔ ہائے اللہ۔ یہ کیا؟ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اتنی جلدی چلے جائیں گے' ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر۔ وہ گھر جہاں زندگی کے قہقہے اور دوستوں کی چیخ پکار سے مکان گونجتا تھا آج غم کدہ بن گیا تھا۔

آج گیارہ جنوری ہے۔ گلوسٹر روڈ پر سیدھے ہاتھ پر تین منزلہ فلیٹوں کی لمبی لمبی قطار دور تک چلی گئی ہے۔ ایک سفید دروازے کی سیڑھیوں کے پاس گھنٹی لگی ہے' اس کے نیچے پلاسٹک کے حرفوں کو جوڑ کر ایک نام لکھا ہوا ہے انشا! لیکن انشا کہاں؟ جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں۔

آج یہاں سوگوار جمع ہیں۔ بھابھی (بیگم انشا) نے جب مجھے دیکھا تو چیخ مار کر مجھ سے لپٹی۔ "سحاب تو نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ یہ مجھے رومی اور سعدی کو اس طرح چھوڑ کر جانے والے ہیں"۔ انشا کا گھر موجود ہے لیکن انشا کہاں چلے گئے۔ بھرا گھر آج کیسا اداس لگ رہا ہے۔

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کو لگانا کیا؟

بخاری صاحب

تراشیدم پرستم شکستم

(بخاری صاحب)

بخاری برادران بی بی اینڈ کو یعنی پطرس بخاری اور ذوالفقار بخاری۔ (کچھ لوگ صحیح بخاری، غلط بخاری بھی کہتے تھے)

پطرس کو مضاحیہ مضامین کی وجہ سے ہم نے پہچانا اور زیڈ اے بخاری کو ڈرامے کی وجہ سے یہ تو بعد میں راز کھلا کہ وہ بہت اچھے ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ پارٹیشن کے بعد کراچی میں کوئی ریڈیو اسٹیشن نہیں تھا۔ یہ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو جیسی بلڈنگ چھوڑ کر آرہے تھے۔ ایسے نازک وقت کی بے سرد سامانی میں انٹیلیجنس اسکول میں خیمے لگا کر براڈ کاسٹ کرنا انھیں لوگوں کا سچا جذبہ تھا جس نے یہاں ریڈیو کو زندگی عطا کی۔ بخاری صاحب ہی کی خوبی تھی کہ بندر روڈ پر ایک بڑا اصطبل تھا جس کو تھوڑے سے دنوں میں اسٹوڈیو میں کنورٹ Convert کر دیا گیا۔ اسٹوڈیو تو نئے بن رہے تھے مگر آل انڈیا ریڈیو جیسی عمارت کا کیا مقابلہ۔ بخاری صاحب نے رات دن ایک کر کے پاکستان کی ایسی خدمت انجام دی جس کا ہماری نئی نسل کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ زیڈ اے بخاری تو لوہے کا انسان تھا۔ ان میں کام کرنے کا اسٹیمنا کتنا تھا جس کی وجہ سے ان کے ماتحت ہر وقت کی محنت سے ہار جاتے اور تھک ہار کر خفا ہو جاتے۔ برائیاں شروع کر دیتے بہت سی مخالف پارٹیاں بن جاتیں جب کسی نہ کسی قسم کی کامیابی نظر آتی تو شرمندہ ہو کر خوشی سے ہاتھ چوم لیتے۔ مذہبی ٹھیکیداروں کے ہتھکنڈوں سے پروگراموں کو بچانا اور اسمیں دلچسپی باقی رکھنا انھیں کا کام

تھا۔ انھیں کے زمانے میں آدھ آدھ گھنٹے کے کلاسیکل پروگرام ہوتے تھے۔ گایک اپنے آپ کو گایک سمجھتا تھا مجرم نہیں۔

ایک صبح میں بھی اپنی سات بجے کی ڈیوٹی ختم کر کے گیٹ پر کار کا انتظار کر رہی تھی اتفاق سے استاد بندو خاں بھی اپنا آئی ٹم ختم کر کے میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور ہم دونوں کے پیچھے مشہور معروف مولانا بھی کھڑے تھے۔ ہم سب کو اپنے گھروں پر جانا تھا پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ سواری کی کار میں بھی مذہب کا دخل ہے۔

میں اور استاد بندو خاں ویگن کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور مولانا کے لئے ڈرائیور کے پاس جگہ چھوڑ دی مگر چونکہ مولانا لالا سے اسکارف میں اپنا منہ لپیٹے کھڑے تھے انھیں بھی جانے کی عجلت تھی وہ ڈرائیور سے خفا ہو گئے کیونکہ ڈرائیور نے کہا تھا کہ ایک ہی پھیرے میں تینوں کو ساتھ جانا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شائد وہ میری وجہ سے ساتھ جانا نہیں چاہتے کہ میں عورت ہوں لیکن وہ تو پورے ریڈیو سے اس بات پر خفا تھے بخاری صاحب کو انھوں نے لکھ کر بھیجا کہ اگر کل سے ان کے لئے علیحدہ گاڑی نہ آئی تو وہ پڑھنے نہیں آئیں گے قرآن۔ بخاری صاحب نے گاڑی بھیج کر انھیں آفس بلایا اور کہا حضور! میں نے معافی مانگ لی ہے مولانا نے کہا کب۔ کس سے؟

بخاری صاحب نے کہا میں نے استاد بندو خاں سے معافی مانگ لی ہے۔

مولانا! یہ تو ہندو پاک کے مشہور استاد فن ہیں یہ ہندوستان چھوڑ کر صرف اپنی ایک سارنگی لے کر آئے ہیں آپ ذرا سوچئے یہ خزانہ اگر ادھر رہ جاتا تو پاکستان کے حصے میں کیا آتا یہ بڑے گنی ہیں میں چراغ سحری بھی ہیں دیکھئے کتنے دن ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ اب فرمائیں آپ کو کیا شکایت ہے۔

سارے شہر میں یہ قصہ مشہور ہو گیا۔ آرٹسٹ کی وہ دل سے قدر کرتے تھے۔ اک بڑے استاد کا مقام انھوں نے پہنچوا دیا۔

صفائی پسند اتنے تھے کہ سفید براق سے کپڑے پہنے رات برات اسٹوڈیو میں چلے آتے تاکہ گھر سے بے وقت بھی آکر خود چیک کر سکیں۔ دفتر میں کئی چپراسیوں کی طلبی ہو جاتی رات کو گندے کپڑے پہنے اسٹوڈیو میں سو رہے ہوتے تھے۔ تمھاری تنخواہ سے جرمانہ کٹے گا۔ معافی مانگتے ہی ہنستے ہوئے چلے جاتے۔

ریڈیو میں قائد اعظم کی تصویر کے نیچے کورے ڈور میں تازہ پھولوں کے گلدستے لگے نظر آتے کیا

شان تھی اسٹوڈیو کی ان کے زمانے میں ریڈیو پر پروگرام ملنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔

اب جا کر اگر دیکھیں تو دفتر اسٹوڈیو کابکیں لگتی ہیں وہ واقعی ایک آرٹسٹ تھے۔ دونوں بھائیوں کے مزاج کتنے مختلف تھے۔ پطرس بخاری کی ٹریننگ جیسے شاعروں کی میٹنگ میں بیٹھے ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نے قدم اٹھانے شروع کئے تھے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو انڈر بل روڈ پر تھا۔ پرانی کوٹھی میں میلی لال اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کو ڈھکے ہوئے بڑے بڑے پام کے درخت، دو تین ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں کے بعد لمبا سا برآمدہ پر قطاروں میں کمرے جو باہر سے بند اور اندر سے پردے لگی چھید والی دیواریں جو آواز کھینچ لیتی تھیں۔ ایک مائک جو چھوٹی سی فیڈر لگی میز پر ہوتا تھا پیانو پر بہت سے رجسٹر پڑے ہوئے تھے جہاں اناؤنسر کھڑے ہو کر اناؤنسمنٹ لکھتا پھر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے سرود سارنگیاں۔ ٹیڑھے میڑھے طبلے چپ چاپ خاموش نگاہوں سے دیکھا کئے ہوتے۔ سائیں سائیں کرتے اسٹوڈیو، طے خانوں جیسی ٹھنڈک لئے دنوں سالوں میں ڈوبی خوشبو میں اب بھی آنکھ بند کر کے سونگھ سکتی ہوں۔ نیلی چمکیلی آنکھوں والے ایڈوانی صاحب جو اس زمانے کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے دبلے پتلے سلک کی شیروانی میں لپٹے الیاس اناؤنسر سے کہا تھا جو دلی کے کسی نواب کی اولاد تھے در د آشنی اپنی بگھی میں آتے تھے الیاس صاحب یہ لڑکی اپ کی ٹریننگ میں رہے گا۔ سمجھا آپ؟

وہ الیاس جنھوں نے کبھی عورت سے بات تک نہیں کی تھی ان پر تو ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر ایڈوانی صاحب اسی جلدی سے پھرتی سے برآمدے کی گھاس پر کود گئے۔

پہلے ہی دن اس ہری ہری گھاس پر الیاس بھی اپنی ہنسی چھپائے ہوئے کود گئے تھے جب میں نے فارسی کا شعر پڑھنا چاہا۔ پہلا مصرع غلط ہوا تو دوسرا مصرع بھی غلط ہو گیا تھا اور بغیر کسی کے ٹوکے میں نے کہا معاف کیجئے گا یہ شعر میں نے غلط پڑھا اب شاعر کا کلام فلاں سے سنئے۔ اور فیڈ آؤٹ کرتے ہوئے آرٹسٹ کو اشارہ بھی کر دیا۔ اس زمانے میں سب لوگ ایک ہی کمرے میں ہوتے تھے۔ پیانو پر لاگ بک پر جھکے ہوئے الیاس میرا آئی ٹم لکھ رہے تھے جو میں نہیں لکھ سکتی تھی مجھے صرف بولنے کی اجازت تھی اور یہ سب کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے نشر کر دیا اب اس حماقت یا میری اس دلیری پر اور خود غلطی کا اعتراف کرنے پر نہ میں ہنسی نہ روئی اور پروگرام شروع کروا دیا۔ الیاس صاحب بھی کیا گانے والے صاحب بھی ہنس رہے تھے بلکہ طبلہ بجانے والے صاحب کو بھی ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا اور الیاس صاحب جنھوں نے کسی عورت سے کبھی بات نہیں کی تھی وہ ہنستے ہوئے باہر گھاس پر کود گئے تھے۔ پھر کیا تھا۔ دوسرے دن کی بڑی سرخی یہی تھی لوگ مجھے دیکھنے برابر آرہے تھے اور ادھر نئے اناؤنسروں کی لائین لگی ہوئی تھیں 'پارلیمنٹ سٹریٹ میں نئے ریڈیو اسٹیشن کے لئے نئی اناؤنسروں کی بھرتی ہو رہی تھی۔ پروڈیوسر انصار ناصری نے اپنی طرف سے دو اناؤنسر تابش دہلوی اور اخلاق دہلوی اردو پڑھنے والوں کو بھرتی کیا۔

ہمیں پطرس بخاری کی کلاس میں جانا تھا۔ متھ۔ بھٹناگر مجھ سے پہلے دن ہی سے خفا تھا۔ بچوں کا پروگرام سمجھ لیا ہے ڈھنگ کے اناؤنسر رکھیں یہ کیا اسکول کی لڑکیاں بلالیں۔

راج ترائن مہرہ نے اپنا دوست بناتے ہوئے بتایا تھا یہ متھ۔ بڑا جیلس ہے۔ کل سے کہتا پھر رہا ہے کہ بخاری صاحب' اسی لئے سب کو ٹریننگ دے رہے ہیں۔ تمھاری اناؤنسمنٹ سن لی ہوگی۔ تم نے نئے اسٹوڈیو نہیں دیکھے سحاب جی تمھاری قسم لاجواب ہیں۔ شیشے لگے کمرے واہ واہ کیا کہنا۔۔ پھر اسی روز کلاس میں ہم سب شیشے لگے چھوٹے چھوٹے کمروں میں بیٹھے تھے جس کو اناؤنسر بوتھ کہتے ہیں۔ ایک ایک انجینئر ہمیں فیڈر چلانا سکھا رہا تھا۔ میرے لئے تو وہ گویا عید کا دن تھا۔ اور میں چپکے چپکے اناؤنسر بن گئی۔۔ گھر کی بغاوت کی یہ آخری اسٹیج تھی۔۔ میں فاتحانہ چل رہی تھی۔۔

دیکھئے حضرات نئے اسٹوڈیوز میں جانے سے پہلے اپنی پرانی تہذیب کو ایک طرف کو رکھ دیجئے۔ ریڈیو کے ڈبے سے آپ کمروں میں نکل آئیں۔ گھروں کے باورچی خانوں میں دوکانوں پر ہوٹلوں میں سڑکوں پر ہر جگہ آپ کی آواز جا رہی ہے۔ اور دیکھو سحاب بی بی! تمھاری پڑوسن کے پاس بھی ریڈیو ہے اور تھوڑا سا گھی ہے پاؤ بھر گوشت اور کھانے والے چار بچے۔ اب سحاب بی بی آپ ان کا گوشت جلوا دیں وہ آپ کے اناؤنسمنٹ میں ایسے محو ہو جائیں کہ ہنڈیا میں پیاز تک جل جائے۔ ایک پاؤ بھر گوشت ایک غریب کے لئے بڑی نعمت ہے وہ نعمت اس سے چھین لیں آپ کی اناؤنسمنٹ میں اتنا پیار ہو کہ جیسے آپ کہہ رہی ہوں کہ "یہ دلی ہے" آداب عرض اور وہ آئے بوا پڑوسن سنا۔ کیسی ہو آج تو میں بنو تم کو ساون کے گیت سنواؤں گی۔ اس کو اپنی باتوں میں لگالو آخری الفاظ تک سمجھ میں آئے۔ سمجھے آپ لوگ۔

پطرس بخاری کی دس منٹ کی کلاس میں چائے بھی مفت ملتی تھی۔ پرانے اناؤنسروں میں متھ۔ بھٹناگر' راج نرائن مہرا' مس آہوجہ اور میں تھی۔ اس وقت تک تابش بھائی اخلاق احمد' نسیمہ اور باجی اناؤنسر نہیں بنے تھے۔ باجی عورتوں کا پروگرام نہ جانے کب سے کروا رہی تھیں قدوسی

صاحب کے ساتھ۔ بخاری صاحب کی سالی سکندرہ جو شمس عارف کی بہن تھیں جن کا ایسے روشن خیال خاندان سے تعلق تھا ان کی آواز ایسی غضب کی تھی آج تک میرے کانوں میں وہ ترنم گونجتا ہے۔ ان کے علاوہ سکندرہ کی سہیلی خورشید اودے اودے۔ نیلے نیلے پیراہن جو اس وقت شادی شدہ نہ تھی یہ دونوں بھی ڈرامہ آرٹسٹ اور اناؤنسر بھرتی ہوئی تھیں فاطمہ خانم، صفیہ معین ڈرامہ آرٹسٹ انور کے ساتھ آئی تھیں۔ ہم کو ایک دو ہفتے ہی میں اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مائیگرفون دنوں کسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ سانس اور اونچے بیچ جو بھی ہو آخری لفظ کھڑے رہیں۔ آخری لفظ ہواؤں میں دور جاتے ہی مٹ جائیں گے۔ وہ چبا چبا کے اپنی گمبھیر آواز میں بولتے رہتے ان کے ذہین چہرے پر سدا کی فریفتہ تھی جس کا ان کو زندگی بھر پتہ نہ چلا۔ کلاس میں سے ان کے اٹھ جانے پر ان کے لحیم شحیم جسم کو دیکھتی رہتی پھر جیسے اندھیرے کونوں میں سے ایک کتا پہلا مصرع عطا کر تا وان کے چلتے ہوئے پیروں سے ایک کتا بھونکتا ہوا پورا شعر عطا کر جاتا پھر وہ چاندنی رات میں پشاور کی گلیوں میں کھو جاتے اور ہمیشہ جب وہ جا رہے ہوتے تو گھنٹوں انھیں کھڑی محو دیکھتی رہتی۔ زیب قریشی مس مسانی انکی دوستوں میں تھی۔ وہ ایک روز زیب کے ساتھ کھانا کھانے صنوبر خاں کے کینٹین میں ریڈیو اسٹیشن کے سب سے اوپر کے تیسرے ونگ میں گئے۔ ہلکے ہلکے قہقھوں میں کیٹس۔ شیلے کے نام زیب کی اونچی آواز مجھ تک پہنچا جاتی۔ ورنہ پطرس تو ایسی شائستگی سے آہستہ آہستہ سگار کے تمباکو کے ساتھ۔ لفظوں کو چھپاتے چلے جاتے۔ اور مجھے الجھن ہوتی کاش میں اور قریب کی میز پر ہوتی۔ اپنی چادر سے زیادہ پیسے لنچ پر دیتی پطرس بخاری کو دیکھنے کے لئے نشست برخاست کے لطف کے لئے۔ ان کو جاننے کی تمنا بڑھتی جاتی۔ اس زمانے کے گورنمنٹ کالج کی کیا بات تھی۔ اس زمانے کے پروڈیوسروں میں پہلا بیچ لاہور سے نیا نیا آیا تھا۔ اور ہم سب کیسے گھل مل گئے تھے۔ مجھے تو ریڈیو نے یہ بھی سکھایا تھا عورت مرد ایک ہیں۔ محض کام ہی کے عنوان مختلف ہوتے ہیں۔ وہ کامیاب ہیں۔ اسٹوڈیوز کی دہلیز کے باہر اپنے سارے اختلافات چھوڑ جاؤ اندر سب ایک ہیں۔ حرف آواز کا جادو ہوتا ہے۔ جو ہر ایک کا پیکر ہواؤں کے دوش پر اڑتا رہتا۔ علم کی جلا سے روشن رہتا۔ لفظوں کے خزانے بکھرتے رہتے ہیں۔ اور بس میں تھی اور یہ دلی ہے آداب عرض گیارہ سال کی اناؤنسر تھی جسے انگریزی کی چار لائنیں کئی روز تک سکھائی گئیں وائسرائے کے لئے نئے اسٹیشن کی مہورت کے لئے۔ اور وہ لڑکی اتنے گورے بھبھو کا ہری آنکھوں سنہرے بالوں والے ایک عینک کو ایک آنکھ پر چمکائے سنہری

تمغوں سے کوٹ لدا ہوا تھا یہ وائسرائے تھے پھولوں کا گلدستہ ایک ہاتھ میں دھرے حیرت سے سوچتی رہی ایک انگریز کتنا گورا چٹا ہوتا ہے یہ شہابی رنگ یہ سنہری ابرو اتنے قریب۔ وہ سب کچھ بھول گئی لیکن یہ ایک آنکھ پر عینک کیسے چپکا لیتے ہیں سنہری لٹکتی ہوئی زنجیر۔ آج سوچتی ہوں سب مجھ سے خفا تھے۔ میں کتنی بیوقوف جاہل تھی۔ بھلا وہ بھی تو بہروپے تھے نا۔ ریکس ہیرسن کی طرح۔ سب اسٹیج پر ہی تو تھے۔ اس وقت بھی اور اسی وقت بھی کل دلیپ کمار شو میں پاکستان کے ایکٹر محمد علی شعر پڑھ رہے تھے۔ مجھے یاد آیا ان کا پہلا روز ریڈیو پاکستان میں جب وہ نوکری تلاش کرنے آئے تھے۔

آج بخاری صاحب کے پروڈکشن کے دن یاد آگئے۔ ماجد میز کے سامنے کھڑے ہیں۔ اسٹوڈیو 5 کے قریب کے کمرے کی آج قسمت کیوں جاگی ہے۔ یہاں کیا ہوگا؟ اور پوری کاسٹ قہقہے لگانے لگی۔ ماجد سب سے زیادہ اچک رہے تھے۔ اب آئی ہو بہن پہاڑ تلے' اور حمایت' فاطمہ' صفیہ سب جیسے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ آج دیکھنا صبح کرنا شام کا لانا قیامت ہو جائے گا۔ قیوم صاحب سگار منہ میں رکھ کر پھر سے چپ ہو گئے۔ چھوٹے سے اندھیرے کمرے میں ماجد اور میں دور سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ امجد ڈرامے کی ریہرسل میں ڈرامے کرتے رہتے تھے تو بہن آج آپ کی ایسی کھنچائی ہوگی کہ بس' میں نے بخاری صاحب کو لگا دیا کہ قید کے سین اس چھوٹے کمرے میں بہت اچھے انفیکٹ کے ساتھ آئیں گے۔ آواز گونجے گی۔

ارے خدا ہی سمجھے تم سے ماجد' بھلا کل تین ڈایلاگ' سر' جہاں پناہ' صاحب عالم' ایک لمبی سی آہ' خدایا مجھ پر رحم کر۔ اس کے لئے میری ریہرسل اس کمرے میں ہوگی؟ اور بخاری صاحب تمہاری بات مان گئے۔ بڑے ہی کمینے ہو۔ میں جل رہی تھی۔ ڈر رہی تھی نہ جانے آج کا دن کیسے گزرے گا۔ یہ پورا ٹکڑا کر پائیں گے یا نہیں۔ ساری کاسٹ سنے گی جب بخاری صاحب مجھے ڈانٹیں گے۔

میرا موڈ خراب ہوا تو ماجد میں نہیں کر سکوں گی۔ لو بھلا مائک میز کے نیچے زمین پر رکھا ہے اور ایک میز کے اوپر۔

اب تو کچھ نہیں ہو سکتا کل شام یہ سب پروگرام ڈسکس ہو گیا تھا ماجد خود ہی خوشی سے گلابی ہو رہا تھا ماتھے پر کنپٹی سے نیلی رگ ابھر آئی تھی جو گنجے پن میں کھو جاتی تھی۔ جب وہ ہنسی ضبط کرتا تھا تو اکثر ایسا ہوتا۔ میں سمجھ گئی مجھے ڈرا رہا ہے۔

یہ سین بخاری صاحب کسی اور کے لئے رکھ رہے ہوں گے خود کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے ڈائیلاگ کو ایکو میں ملوث کر رہے ہوں گے تاکہ اور کھرج پیدا ہو سکے نیچے بیٹھنے سے سانس کو بھی آسانی سے کنٹرول کر سکتے ہیں۔

وہ میوزک اسٹوڈیوں میں پونا والی گلاب بائی، کجن بیگم، وصی اختر کی آوازوں میں شاہانہ راگ میں انار کلی کے لئے گیت ریکارڈ کرا رہے تھے۔ اتنے ساز بج رہے تھے کہ مغل اعظم کا دربار یاد آگیا۔ وہ جھومتے ہوئے چٹکی بجاتے ہوئے نہال عبداللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسٹوڈیو سے نکلے۔ اچھا مری جان۔ جلدی سے بہترین ریکارڈ ہو جائے۔ لمبا جنگ چاہئے ڈائیلاگ سپر امپوز Super Impose کرنا ہے۔ چلو بھئی جلدی جلدی اپنی جگہوں پر۔ مری جان میں جان آئی۔ یہ چھوٹے سے کمرے کا سامان مرے لئے نہیں ہے۔ سب سے پہلے ماجد کی کھنچائی ہوئی۔ آپ نے ریہرسل کیوں نہ کروائی؟ اب مجھے پھر سر کھپانا پڑے گا۔ بینل پر وہ ڈھیر ہو گئے۔ ہم سب سانس لئے ہوئے روبوٹوں کی طرح اپنے اپنے مائیکروفون پر کھڑے ہو گئے۔ انار کلی کو قید خانے سے بلوایا گیا۔ انار کلی۔ ثریا۔ ماں اور شہنشاہ کا سین تھا یہ کیا بے ہودگی ہے؟ قید خانے کا سین کدھر گیا۔ ماجد! ماجد! کل شام کیا طے ہوا تھا اور میرے پاؤں سے اسٹوڈیو کی زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

خدایا! ماجد کو عین وقت پر ایسی کھانسی آئے کہ بول نہ سکے میں نے دل میں کوسا۔

اندھیرے ٹھنڈے کمرے کی صرف ٹیبل لیمپ کی روشنی میں میری آواز کانپ رہی تھی میز کے نیچے بیٹھی منہ ادھر کر کے اوپر کے مائک تک اپنی آواز پہنچاتی تھی۔

صاحب عالم! آہ۔ کتنا اندھیرا ہے۔ رحم کر خدایا آہ۔

مری آواز کی لرزش میں میرے آنسو حلق میں تحلیل ہو رہے تھے حقیقت میں اور بخاری صاحب خوش تھے Good, good-more pause پھر سے۔

اور ادھر میں اپنے غصے کو مجبوری کو حلق کی سوکھی دیواروں کو آواز کے زور سے کھینچ رہی تھی۔ لفظ ٹکڑے ٹکڑے ہو ہو کر اندھیرے میں گر رہے تھے کھو رہے تھے۔ کئی گھنٹوں کے اس عذاب سے جب اٹھی تو ٹانگیں بھی کئی کئی من کی ہو گئی تھیں۔ ہاتھ اٹھاتے گراتے بھاری زنجیر پکڑے پکڑے ٹھنڈے برف ہو گئے تھے۔ اصل میں بخاری صاحب۔ آہ سے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ میں نے جب آہ بھری یعنی انار کلی بھوکی پیاسی تھی کئی روز سے قید خانے میں 'نازک

کلائیوں میں زنجیر اور نقاہت میں ڈوبی آہ کو صاف سننا چاہتے تھے۔ یہ سب تین جملے بڑی محنت کے تھے۔ انار کلی کا مجسم پیکر تو مائک نے سننے والوں کے سامنے دکھایا یا نہیں مجھے نہیں معلوم۔ بدقسمتی سے اس زمانے میں یہ سارے جشن تمثیل لائیو Live ہوتے تھے اور میں ادھر سدا کی لاپروا اپنے پروگرام کی کبھی کوئی ریکارڈنگ نہیں رکھی۔

امتیاز علی تاج کا انار کلی۔ جشن تمثیل میں چار چاند لگا گیا۔ بخاری صاحب کی پروڈکشن تھی ٹاپ کلاس کاسٹ' پھر آسانیاں بخاری صاحب کی پھرسے' وقت ان کے پاس تھا ایک ایک سین سنتے کرواتے دوبارہ تبارا۔ وقت مقررہ سے پہلے کئی کئی مرتبہ سنتے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی کچھ کہہ سکے۔ میں جو سدا کی پہلی دفعہ کی عادی اتنی دفعہ کی ریہرسل سے تنگ آجاتی ہر وقت ایک جیسا بول ہی نہیں سکتی کل کسی طریقے سے پرسوں کسی اور طریقے سے مگر خدا کا شکر بخاری صاحب یہ نوٹ کر لیتے تھے تو بھی کچھ نہیں کہتے تھے مجھے اپنی کمزوری معلوم تھی۔ چھوٹے کمرے کا سین انہوں نے ریکارڈ کر دیا تھا۔ جو مجھے نہیں معلوم تھا۔ حمایت علی شاعر اور میرے سین پر انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا تھا۔ اور میں بھی تقریباً طے کر چکی تھی چند منٹوں میں چاہے نوکری رہے یا نہ رہے میں اسکرپٹ پھینک دوں گی اگر انہوں نے مجھے اور ڈانٹا۔

انار کلی کے اسکرپٹ ملنے پر بخاری صاحب سے اکیلے کمرے میں جاکر چپکے سے اجازت چاہی تھی "بخاری صاحب مہربانی سے مجھے انار کلی کے بجائے دل آرام کا پارٹ دے دیں' میں دل آرام کا پارٹ اچھا کر لوں گی۔"

ہشت۔ دل آرام کا پارٹ' چل ہٹ پرے اور فاطمہ خانم کو انار کلی بڑی آئی ہیں دل آرام کا پارٹ کرنے۔ چل بھاگ! یہی کرنا ہے" میں کہتا ہوں تمہاری آواز کے لئے چلو بھاگ جاؤ اور میں چپ چاپ واپس آگئی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

زندگی میں پہلی بار نوکری بری لگی۔ اپنے آپ کو کتنا مجبور پایا۔ اگر پھر سے بخاری صاحب نے ڈانٹا کیسے سہار سکوں گی۔

۱۵-۱۶ دن کی مصیبت کے بعد آج شام کو ۷ بجے آخری ریہرسل میں مجھے پھر اس ڈانٹ کے بعد مری طبیعت صاف ہو گئی۔ ٹھیک ۹ بجے ڈرامہ ہونے والا تھا۔ میں نے بھی بخاری صاحب کی طبیعت صاف کر دی گو کہ وہ ڈرامہ کھیل گئے ہنستے ہنستے اسٹوڈیو میں آکر لمبے لیٹ گئے اور میں سمجھ گئی تھی کہ مری نوکری تو کل سے ختم۔ چلو ایک طرح کی ایک سوئی ہوئی طبیعت ٹھہراؤ پر آگئی

تھی۔ بے چینی ختم ہو گئی اب آخری داؤں پر کیا کرتے۔

ساری کاسٹ چپ تھی مرے آنسو مری آنکھوں نے چھپالئے تھے۔ آواز کی لرزش میں تیزی تیروں جیسی چبھن تھی یا اس پار یا اس پار۔ میں نے اپنے ڈایلاگ ختم ہی کئے تھے کہ اتنی زور سے پینل پر گھونسا مارا۔ سحاب میرا نام واقعی شہنشاہ اکبر ہے۔ واقعی اکبر نے للکارا تھا۔ پہلی دفعہ ہی کانپ گئی۔ اسکرپٹ گر پڑا حمایت کی ڈری ہوئی شکل دھندلی ہو گئی جو سیاہ دھوئیں میں ڈوبا بدھا مرے سامنے مائک پہ کھڑا سلیم تھا۔

اور میں بھی بپھر گئی۔ جی بخاری صاحب! میں نے چیخ کر کہا "انار کلی نے نہیں دل آرام نے۔ آپ کہتے ہیں مجھے دو آنے والا رومانس نہیں چاہئے۔ آپ کہتے ہیں شہزادہ سلیم تمہارے سامنے کھڑا ہے جواب جلدی تم سے چھڑالیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے' سحاب مجھے انار کلی چاہئے جو خوابوں کی دنیا میں رہتی ہے وہ چاہئے جو اپنے شاہزادے سے آخری بار مخاطب ہے سمجھیں؟ محبت چاہئے انار کلی چاہئے دل آرام نہیں چاہئے۔"

اور نہ جانے کیسے رندھے ہوئے گلے سے میں نے چیخ کر کہا بخاری صاحب! یہ حمایت مائک پر مرے سامنے کھڑا ہے۔ اور مجھ کو دیکھ رہا ہے میں اس سے کیسے کہہ دوں؟ اتنے قریب اسے دیکھ کر کہ تم نے مری راتوں کی نیند اڑا دی۔ میں ہرگز نہیں کہہ سکتی مرا اس کا مائک الگ الگ کر دیجئے۔ میں اس سے کیسے کہوں کہ مجھے کہیں لے چلو۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا:

مجھے صرف الگ مائک چاہئے اور اسکرپٹ نیچے گر پڑا۔ جو ماجد اور حمایت نے جلدی سے اٹھا کر دیا۔ بوتھ خالی تھا اور بخاری صاحب غائب۔

ساری کاسٹ مجھے گھور رہی تھی۔ آج یہ ڈرامہ نشر نہیں ہو گا۔ میں بھی دل میں تھوڑی سی ڈری اتنے دن کی سب کی محنت تھی۔

دھڑ سے دروازہ کھلا اور بخاری صاحب اسٹوڈیو میں اوندھے ہنستے ہنستے لیٹ گئے پھر دو ہتڑ مار کر بین کرنے لگے۔ اوئے ٹُے حمایت تو تو دو کوڑی کا ہو گیا۔ کیا اوقات رہ گئی تیری اور پھر سارا اسٹوڈیو روبوٹوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

سب ایسے خوش جیسے جان بچ گئی سب کی صرف قصوروار میں تھی۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا سب بخاری صاحب کے موڈ کی طرف بہ رہے تھے۔ سب کو اطمینان ہوا کہ ان کا کنٹریکٹ

Contract ٹھیک ہے رات کو پروگرام نشر ہو گا اور ان کو چیک مل جائیں گے۔ان کی بلا سے سلیم کو انار کلی ملے نہ ملے ادھر انار کلی کی جان پر بنی تھی جیسے سارا قصور میرا تھا۔گرجتی آواز سنائی دی تم سب مرے اکاؤنٹ پر چائے پی لو۔ ٹھیک آٹھ بجے اسٹوڈیو میں 'کوئی غلطی برداشت نہیں ہوگی۔گو۔ Go۔

میں اندھیرے سے اسٹوڈیو میں بیٹھی اس پھینکے ہوئے اسکرپٹ کو سینے سے لگائے سوچ رہی تھی انار کلی بیگم کب تک خیر مناؤ گی۔اسی تھسے سے اپنے کتنے اچھے دن کھوئے' آرام آسائش کھویا ورنہ مرد کو میٹھے بول ہی تو چاہئے ہوتے ہیں۔اپنے تخت و تاج کی بدولت۔اتنا بڑا شخص جس کی تم دل سے عزت کرتی تھیں اس دن کے لئے۔تم لئے دیئے رہتی تھیں کہ یہ تم کو کچھ نہ کہے وہ بھی تم کو اب تک ایسا مقام دیتے آئے تھے جس میں تم ان کے زاویہ سے آغا شاعر کی بیٹی تھیں پر آج تم نے وہ مقام کھو دیا۔پھر بھی انہوں نے تم کو کچھ بھی نہیں کہا وہ چاہتے تو اسکرپٹ ہاتھ سے چھین کر تم کو نکال بھی سکتے تھے۔بھری کاسٹ کے سامنے آپ نے چھوٹائی بڑائی کا خیال رکھا؟اور میں اپنی نظر میں ایک خود سر لڑکی تھی جو شروع ہی سے دل آرام بننا چاہتی تھی۔

چلئے سحاب چائے پی لیجئے۔ماجد' قیوم بھائی' چھوٹے کمرے سے باہر کھڑے مجھے بلا رہے تھے۔ میرا جی چاہا ان سب کو دھتکار دوں چلے جاؤ یہاں سے۔

دیکھو عطار کا لونڈا آیا ہے۔اب تو باہر آجائیں سحاب' اور میں ہنس پڑی۔ماجد تم بہت خبیث ہو (ایک دفعہ میر تقی میر کی فلم بنانے کے ئے سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے جو کہ ہم سب اکثر ایسے ہی ان ہونے خواب تو دیکھا ہی کرتے تھے) تو ماجد نے بڑے پیار سے پوچھا تھا سحاب مجھے کون سا پارٹ ملے گا۔سب سوچ رہے تھے کہ ظاہر ہے ماجد سے کون اچھا بولتا ہے۔ماجد یا سلیم (میں ایسے ہی موڈ میں تھی۔میں نے قیوم بھائی سے کہا کیوں قیوم بھائی! یہ عطار کے لونڈے کے لئے موزوں ہے یا سلیم) دونوں مجھے مارنے کے لئے اٹھے پھر کیا تھا۔ریڈیو ہی ایسا محکمہ ہے جہاں فقرے جملے کسی پر چست ہو جائیں تو کونوں کونوں پھیل جاتے ہیں اسی کی سب کھاتے ہیں وہ سب کہاں گئے جو اشاروں کنایوں سے داستانیں سنایا کرتے تھے ایسے پڑھے لکھے ہنرمند اب کہاں اس ریڈیو کو نصیب۔تہذیب کے گہوارے میں پلے بڑھے لوگ ایسے آرٹسٹ ایسے پروڈیوسر جو اپنے مزاج میں برابر آرٹسٹ کا مزاج بھی پرکھتے تھے۔بخاری صاحب مجھے مرے اس رویے سے سزا بھی دے سکتے تھے مگر انہوں نے نیچے جا کر اپنے کمرے میں سوچا ہو گا۔پھر انجینئر کو فون کئے ہوں گے۔

آٹھ بجے ہم سب جب اسٹوڈیو میں آئے۔ ۹ بجے جشن تمثیل کا ڈرامہ نشر ہونے والا تھا جسے زیڈ اے بخاری پیش کر رہے تھے۔ سب میں بجلی کے تاروں جیسی طاقت سرعت کر گئی تھی۔ اور انار کلی اپنے اندر کی انار کلی سے لڑ بھڑ کر جب اسٹوڈیو پہنچی تو وہ بھول چکی تھی کہ اس کے لئے کونے میں ایک اکلوتا مائی کروفون لہک لہک کر گلے لگانا چاہتا تھا جس میں انار کلی کے کھلے ہوئے مرجھائے ہوئے کتنے ہی پھول۔ بھولے بسرے چہرے اس کی فتح پر مسکرا رہے تھے۔ تم آؤ ہمیں پیار کرو تم نے ہم سے صرف باتیں کیں، چھوا تک نہیں۔ ہمیں آج چھو لو چوم لو ہم تمہارے ہیں۔ تم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم تم سے آج سب کچھ کہہ دیں گے آؤ پردہ اٹھاؤ ہمارے سانس ہماری چاہت ہماری آوازوں کو چھو کر تو دیکھو ایک ہلکا سا ساتھ ہمارا تمہارا ہے میں تمہارا سلیم تھا۔ تم نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ آج میں اپنی محبت کے سارے پھول تمہارے لئے لایا ہوں۔ مرے گرم سانس کو اپنی آنکھوں کے قریب لاؤ اور میری انار کلی نرم شبنم کے پتوں کے رتھ پر بیٹھ چکی تھی تو سلیم کا ہاتھ اس کے لرزتے ہاتھوں میں تھا۔ پھولوں بھرے رستوں میں اس کی آواز کے جل ترنگ بجنے لگے۔

اور جب اس کے چاروں طرف اینٹوں کی دیوار بلند ہوتی گئی تو وہ سچ مچ گھبرا گئی اس کا سانس گھٹنے لگا۔ گلا خشک ہو گیا وہ خدا کے کتنے قریب تھی اس کی پیاسی روح چاروں طرف سر پٹک رہی تھی۔ مرا دم گھٹ رہا ہے مجھے ہوا چاہئے۔ مجھے ہوا چاہئے۔ اور انار کلی دیوار میں چن دی گئی۔

اسٹوڈیو نمبر 5 چپ تھا۔ ایک آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ انار کلی ڈرامہ آپ کراچی سے سن رہے تھے۔

پھر وہ ہواؤں پر سیڑھیوں سے اتر رہی تھی تھکی تھکی مضمحل سی اور گہری گہری آنکھیں ابروؤں کے بالوں سے نیچے سے گھور رہی تھی۔ پگلی آج کر ڈالا اکبر کو۔ سلیم کو قتل کر ڈالا۔ مجھے دل آرام دے دیجئے بے وقوف لڑکی۔

واہ واہ کیا خوب صورت انار کلی نکال کر لائی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ، اور وہ مجھے اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر سیڑھیوں سے اتار رہے تھے۔ دوسری طرف حمایت تھا۔ میں حمایت سے شرمندہ تھی اور میں نے اس طرح معافی مانگی۔ دیکھو نا حمایت! تم اتنے چھوٹے تو ہو خفا نہ ہو تم تو کبھی بڑے لگتے ہی نہیں پھر کس طرح سلیم بنتے۔ مجھے معاف کر دو اور ادھر میں اپنے مشفق پروڈیوسر سے لاکھ ارادے کرنے پر معافی نہ مانگ سکی جیسے انہوں نے مجھے معاف کر دیا ہو اور جس طرح وہ سمجھتے تھے

کہ میری ڈیمانڈ ٹھیک ہی تھی۔ ان کی انا کو ذرا بھی ٹھیس نہیں لگی۔ یہ ان کی کتنی بڑائی تھی۔ اگر انہیں کوئی بات پسند آجائے یا کوئی حرکت بچوں کی طرح خوشیاں مناتے تھے۔ بخاری صاحب جیسا ریڈیو کو چاہنے والا اب کبھی نصیب نہ ہو گا۔ اتنا اچھا براڈ کاسٹر اب کبھی پیدا نہ ہو گا۔ ریڈیو ان کی زندگی تھی اوڑھنا بچھونا تھا اس کی تربیت میں زندگی کے کچھ دن اور ادب پر باقی دن نثار کر دیتی۔

جشن تمثیل کے دوسرے ہفتے شوکت تھانوی کا لکھا ہوا ڈرامہ اپسٹک نشر ہوا تھا۔ سوچتی ہوں اس زمانے میں یہ پڑھا لکھا رائٹر کیسی کیسی چیزیں نکال کر لاتا تھا۔ دنیا کی ترقی کی رفتار پر حیرت ہوتی ہے کہ نئی نئی ایجادیں سامنے آرہی ہیں۔ کھانے پینے کے جھمیلوں سے لوگ تنگ آجائیں گے زندگی ایسی مصروف ہو جائے گی کہ پیٹ بھرنے کے لئے چند گولیاں کھا لینے سے طبیعت سیر ہو جائے گی گولیاں کھا کر بوتل سے پانی پی لیا اور نمٹ گئے۔ اس ڈرامے میں شوکت نے یہی بتایا تھا کہ ادیب اور شاعر بھی عملی زندگی میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں موجودہ رسم و رواج کے پابند ایک باپ کی بیٹی اور ہونے والا داماد دونوں اس نئی دنیا کے نوجوان ہیں دونوں محبت میں سرشار ہیں اور درخشاں مستقبل کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بیٹی نے باپ سے بغیر اجازت لئے ہوئے پائیلٹ منگیتر کے ساتھ آسمان کے بلندیوں کا رخ کیا اور ریڈیو فون سے انہیں باپ سے شادی کی اجازت مانگی ہے۔ باپ اور چچا کے درمیان یہ ڈرامہ تھا اس میں کل تین کردار تھے لڑکی کا پارٹ میرا تھا، بخاری صاحب باپ اور چچا شوکت تھانوی خود تھے۔

اس زمانے میں ڈرامے لائیو Live نشر ہوتے تھے ریکارڈنگ میں جو غلطی ہو گئی اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔ سب کی جان نکلی جاتی تھی خاص طور پر میری۔ میں نے مائک کے ڈیڈ سائڈ سے آگے ہو کر چیخ کر کہا۔ ابا جان آداب! آپ کیسے ہیں؟۔ میں اس وقت اتنی بلندی سے ہوائی جہاز سے آپ سے بات کر رہی ہوں کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا معاف کیجئے میں اپ سے بغیر اجازت لئے آگئی تھی بے حد جی چاہتا تھا کہ آسمان تک پہنچوں۔ ابا جان خدا کی قسم بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بادل روئی کے گالوں کی طرح آسمان پر تیر رہیں ہیں ہمارے جہاز سے کبھی نیچے چلے جاتے ہیں کبھی ہمارے پاس آجاتے ہیں۔ اللہ ابا جان آپ خفا نہ ہوں میں کتنی خوش قسمت ہوں یہ مرتبہ مجھے ملا میں اللہ کے کتنے قریب آچکی ہوں۔ جہاز پر آنا سب ایسی جلدی میں طے ہوا انہیں بغیر دیر کئے جہاز پر جانا تھا میں معافی چاہتی ہوں کہ آپ سے اجازت نہ لے سکی چچا جان سے میں ضرور پوچھ آئی تھی۔

بخاری صاحب کو سنتے وقت خیال آیا کہ انھیں بھی آواز سے ایفکٹ Effect دینا چاہئے اس کے لئے وہ سارے اسٹوڈیو میں ادھر سے ادھر Effect دیتی پھرے چچا جان (شوکت تھانوی) جو بیٹھ موڑے کیو میں کھڑے تھے اور میں منتظر تھی کہ ان کا جملہ آئے تو میں بولوں میری آواز جیسے بہت دور سے آرہی تھی کبھی نزدیک آجاتی تھی گویا ہوا کی لرزش محسوس ہو سکے۔ اس کی بھی میں نے گھر بیٹھ کر پریکٹس کی تھی یہ میرا خیال تھا۔۔۔ جملے تو پروڈیوسر کو بولنا تھا۔

ایک دفعہ میں ڈر کر اچھل گئی۔

کسی سے اجازت لی تھی؟۔ وہ غصے سے بھرے ہوئے بول رہے تھے۔ انھوں نے دوڑ کر میز سے گلاس اٹھالیا اور اپنا اسکرپٹ اس کے منہ پر رکھ دیا پھر اسکرپٹ کے پیچھے سے بولنے لگے۔

یہ کیا زمانہ آگیا ہے کہ تم بغیر اجازت اپنے منگیتر کے ساتھ جہاز پر چلی گئیں۔ بے ہودہ' بدتمیز لڑکی تم نے اس کی مجھ سے اجازت تک نہ لی۔

ان کے مکالمے تو اسکرپٹ پر لکھے ہوئے تھے جو وہ گلاس کے منہ پر منڈھ چکے تھے وہ بالکل بھول گئے کہ آگے کیا کہنا تھا۔ میری تو خوف سے جان ہی نکل گئی آواز کھینچتی ہوں تو آواز گلے کے خشک ہو جانے کی وجہ سے حلق میں غائب ہو گئی مگر ہوش و حواس برقرار تھے میں پسینے پسینے ہو گئی یا اللہ! ۴۵ منٹ تک تو صرف میرے اور چچا کے ڈائی لاگ ہیں۔ کیسے بولیں گے کیا ہو گا پھر اور ریچھ Overlaping بھی شروع ہونے والی تھی کہ میں نے انھیں سمجھایا "ابا جان یہ کہتے ہیں کہ ہم سے نکاح کرنا چاہتے ہیں آپ جلدی اجازت دے دیں۔"

تمھیں یہ کہنے کی جرات کیسے ہوئی؟ ماشاء اللہ مجھ سے اجازت مانگ رہی ہو۔ انھیں ڈائیلاگ یاد آگئے۔

کیا کہا تم نے ذرا پھر سے تو کہنا۔ وہ میز پر رکھے ہوئے گلاس کے منہ پر بدستور اسکرپٹ منڈھے ہوئے تھے۔ Effect ایفکٹ تو خوب رہا لیکن آخر کیا بولیں؟

شوکت تھانوی اپنا ماتھا کئی بار اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے۔ پلٹ پلٹ کر دوسری طرف مڑ جاتے کہ میں نے ان کو پیچھے سے آہستہ سے پکڑا۔

ابا جان! آپ چچا جان سے پوچھ لیجئے۔ ہم نے طے کر لیا ہے' یہ کہتے ہیں کہ باہر کے ملک میں ٹریننگ کے لئے جا رہے ہیں۔ نہیں تو۔

نہیں تو کیا؟ پھوٹتی کیوں نہیں' بے ہودہ اولاد۔

میں نے شوکت تھانوی کا اسکرپٹ ان کے سامنے کیا کہ ڈایلاگ پڑھ لیں مگر اب تک سب مطلب خبط ہو چکا تھا ترتیب خراب ہو چکی تھی۔ اب مجھے یاد آیا سب سے دلچسپ حصہ جو مجھے مزے لے لے کر بہت پہلے بتانا تھا وہ آخر میں آگیا تھا مگر غلطی خود بخاری صاحب سے ہو چکی تھی۔
میں نے مائی کروفون سے علیحدہ چیخ کر کہا۔ اباجان! کیا مزے کا کھانا تھا جہاز پر۔ انھوں نے مجھے دو گولیاں چوسنے کو دی تھیں۔ گولیاں گھلیں تو لگا کہ لذیذ قورمہ ہے اور شیرمال کا مزا منہ میں گھلا ہوا ہے۔ یہ سائنس کا کمال ہے نا کہ تین تین گولیاں ہم دونوں نے کھائیں اور مزیدار کھانوں سے پیٹ بھر گیا۔ اباجان کاش آپ بھی ہمارے ساتھ ایسے مزیدار کھانے میں شامل ہوتے۔
اب جو میں دیکھتی ہوں کہ بخاری صاحب مجھے گھور رہے ہیں۔ نہ جانے میں کتنی لائنیں جمپ Jump کر چکی تھی اور انھیں اسکرپٹ میں یہ حصہ نہیں مل رہا تھا۔ اصل میں یہ لائنیں پہلے تھیں لیکن وہ اس وقت اسکرپٹ منڈھے گلاس پر Effect ایفکٹ دینے میں محو تھے۔
شوکت تھانوی بے چارے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے ڈرامے کا یہ حشر ہوگا اور وہ بھی ڈرامہ فیسٹیول میں مگر اتنے بڑے بخاری سے بھلا کون جیت سکتا تھا۔ اس Situation سچویشن کو انھوں نے اس طرح بنادیا کہ شوکت تھانوی کو کان پکڑ کر مائک کے پاس لائے اور کہا۔
قبلہ بھائی صاحب! آپ اجازت صاحبزادی کو دے دیں کہ وہ اپنے منگیتر کے ساتھ ہوائی جہاز پر سیر کر آئیں۔ پھر کہا میں بھی چچا ہوں آخر۔ اب دونوں نارمل تھے دونوں اپنے اپنے اسکرپٹ لے کر اپنے جملے خوبصورتی سے بولنے لگے اور مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔
مجھ پر گھبراہٹ تو طاری ہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ ڈرامے کا ستیاناس ہو گیا اب کیا ہوگا۔ میں کسی طرح اشارہ بھی کروں تو کون سمجھے گا اور مانے گا۔ بخاری صاحب ادھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے شاید ایک دوسرے کا امتحان لے رہے تھے۔ بالآخر شوکت تھانوی نے سچویشن کو سنبھالا۔
ارے بھائی صاحب! ساری زندگی بھر کی محرومی کو چھوڑیئے۔ بچی کا خیال کیجئے۔ دیکھو نا اب بھی تو آسمان کی اونچائیوں سے آپ سے اجازت کی طالب ہے۔ وہ لیجئے بھئی! پھر ٹیلی فون کر رہی ہے۔ جناب والا! بچی کو اجازت دے دیجئے نا۔
میں نے رزاق کو اشارہ کیا کہ وہ گھنٹی بجائے مجھے کیو چاہئے تاکہ جلدی سے ڈرامہ نارمل طور پر شروع ہو جائے۔ اور اپنی اسکرپٹ کے جو صفحات استعمال ہو چکے تھے بخاری صاحب کو دیئے تاکہ وہ اس گلاس پر منڈھ لیں اور اپنا پارٹ وہاں سے نکال سکیں۔ اس پر بوتھ میں موجود لوگ مسکرا

پڑے۔ گھنٹی بجتے ہی بخاری صاحب شعر پڑھ رہے تھے شوکت تھانوی نے ذرا غصے سے کہا۔ بھائی صاحب! کچھ تو سنجیدگی سے کام لیجئے اب جو بھی فون کرے تو اسے ہرگز نہ ڈالیے دیکھو نا کتنی بلند اور پر خطر اونچائیوں سے وہ آپ سے التجائیں کر رہی ہے۔

میں نے بخاری صاحب کو اسکرپٹ دیا اور جہاں سے انہیں بولنا تھا اس پر نشان دہی بھی انگلی سے کر دی۔ بخاری صاحب اپنی مخصوص کھرج دار آواز میں بولے۔

"اچھا لڑکی! تم پہلے ہمارے پاس آؤ اور معافی مانگو۔ آسمان سے باتیں کرنے والی زمین پر اتر آؤ تب بات کرو۔ ہم تمہارے باپ ہیں دشمن نہیں۔ سارے اسٹوڈیو میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ بخاری صاحب دل میں سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا میدان مار لیا۔ کوئی Fluff بھی نہیں آیا' اور کیسا لچھے دار خوبصورت پروگرام صوتی اثرات سے بھرپور سننے والوں کے کانوں سے اتر کر دلوں میں پہنچا ہے۔ نیا خیال تھا برجستہ اور خود ساختہ جملے جن میں زندگی کی گرمی شامل تھی۔ اس زمانے کے جینئس کیسے کیسے بھرم رکھ لیتے تھے اور ریڈیو اور اسٹوڈیو کے پروگرام بہت دنوں تک سننے والوں کو یاد رہتی تھی جو برابر چرچے کرتے رہتے تھے۔ اس پچویشن میں کہ اسکرپٹ کے بغیر حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے شوکت تھانوی اور بخاری صاحب کی نوک جھونک کے برجستہ جملے کیا کارنامہ انجام دے گئے۔

بخاری صاحب فن کی بلندی پر تھے پہلے انھوں نے لگ کر جی جان سے فن کو سیکھا تھا اور اب وہ ایسے باکمال فن کار تھے کہ ان کی محبت اور ہدایت سے دوسرے سیکھتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی اچھی پرفارمنس Performence پر خوش ہو جاتے تھے بلکہ قدر کرتے تھے۔ پروگرام اچھا ہو جاتا تو خوشی سے سرشاری میں سارا جسم ناچنے لگتا۔

ان کی سخت ہدایت صفائی کے بارے میں ایسی شدید ہوتی تھی کہ کیا مجال اسٹوڈیو میں کسی کوڑے دھبے کا کوئی نشان دکھائی دے۔ صاف شفاف دیواریں تازہ صد رنگ پھولوں کے گلدستے جگہ جگہ کونے کونے پر آویزاں۔ اجلی براق چاندیوں پر صاف گاؤ تکئے لگے ہوئے۔ صاف شفاف کپڑوں میں ملبوس ہر آنے جانے والی کے منصب کا خیال۔ آرٹسٹوں کی بے حد عزت کی جاتی تھی۔

استاد چاند خاں بہت بوڑھے ہو گئے تھے ان کی آواز لرزنے لگ گئی تھی پھر بھی ان کی خواہش تھی کہ انھیں زیادہ ڈیوریشن کا پروگرام دیا جائے۔ انھوں نے میرے سامنے بخاری صاحب سے

کہا تھا۔ بخاری صاحب آپ ایک بار مجھے ایک گھنٹے کا پروگرام دیجئے۔ ایک دفعہ تو اللہ جانتا ہے آپ کی موسیقی کے طفیل ایسا رنگ جماؤں گا کہ یہ لونڈے حیران ہو جائیں گے کہ استاد چاند خاں بھی کوئی استاد تھا اور بخاری صاحب نہایت خندہ پیشانی سے انھیں خوش کرنے کی باتیں کرتے رہے۔

بخاری صاحب شاعر بھی تھے سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے اور اچھے شعر کی بے پناہ داد بھی دیتے تھے۔ مشاعروں میں آتے تو آکر اس طرح بیٹھ جاتے کہ گویا نہ ان کے گھر کی محفل ہو۔

میں نے ایک گرم رات کو ریڈیو مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ کچھ نئے شعر کہے تھے سوچا یہی پڑھا جائے اس میں دو ایک شعر مجھے بھی بے حد اچھے لگے مجھے خوشی ہوئی اور مشاعرے کی شرکت کی منتظر رہی۔ ریڈیو پہنچی تو وہاں مشاعرے سے پہلے جو صاحب کلام شاعر سے لے لیتے ہیں انھوں نے میرا پرچہ لیا خاموشی سے پڑھا بالکل چپ رہے اور پرچہ فائل میں رکھ لیا۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر میں خاموش تو رہی لیکن تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس کی بنا پر میں بے چین ضرور ہو گئی۔ خدا خدا کر کے مشاعرہ میں میری باری آگئی۔ مشاعروں میں اکیلی عورت تھی۔

وہی مشاعرہ کنڈکٹ کرنے والے کالی شیروانی میں ملبوس صاحب گو مجھے ریڈیو کی ملازمت کی وجہ سے جانتے بھی تھے لیکن وہ مجھے اس طرح تک رہے تھے کہ "گویا نہیں دیکھا"۔ انھوں نے میرا نام اناؤنس کیا اور میں نے اپنے اشعار پڑھنا شروع کئے مطلع ہی پڑھا تھا کہ تعریف کا شور بلند ہوا۔ نہ جانے مجھ میں کہاں کا اعتماد پیدا ہو گیا اور مجھ سے دوبارہ شعر پڑھنے کا اصرار ہوا تو میں نے دیکھا بزرگ شعراء تک اشعار دہرانے کی فرمائش کر رہے تھے میں نے کنکھیوں سے کنڈیکٹ کرنے والے صاحب کو دیکھا جو اب نظریں جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ جو میں نے یہ شعر پڑھا:

بجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم
دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

شعر واقعی معقول ہوا چھتیں اڑ گئیں مشاعرہ ختم ہوا تو تقریباً سب ہی نے مجھے داد سے نوازا اس وقت میری مسرت نے کنڈکٹ کرنے والے صاحب کی کج ادائی کو میرے دل سے بھلا دیا۔ بخاری صاحب ابھی اسٹوڈیو میں داخل ہوئے اندر آتے ہی انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ارے

بھئی آغا شاعر کی لڑکی آج تو تو نے کمال کر دیا میں گھر سے گاڑی بھگا کر آیا کہ تم کہیں چلی نہ جاؤ۔ واہ بھئی واہ کیا شعر کہا ہے دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے کرسی پر ٹک گئے۔ صاحبان کھڑے ہو گئے تھے، بزرگ قمر جلالوی بھی کھڑے تھے بخاری صاحب اگر کسی کی تعریف کر دیں تو سارا ریڈیو روباٹوں کی طرح شروع ہو جاتا تھا۔ بخاری صاحب جھوٹی تعریف سے پرہیز کرتے تھے مگر میری تعریف میں میرے دل بڑھانے والے سچے الفاظ ان کے خلوص اور حقیقت پر مبنی تھے جو ان کے دل سے نکل رہے تھے مجھے لگا کہ آج بھی میں نے ان کی پروڈکشن پر اچھا کام کیا ہے اس لئے وہ اپنی فتح پر خوش ہو رہے ہیں۔

پھر ایک روز گانے کے ریکارڈنگ کے پروگرام کے تحت بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اس لئے چھپے ہوئے پروگرام کی بجائے Spoken word ہی بولے جاسکتے تھے۔ میں نے ۲۰ منٹ تک اندھیرے اور سخت گرمی میں اپنی ڈائری سے اشعار پڑھے اور CloseUp کر کے پسینے میں نہائی ہوئی باہر آنے لگی باہر تو دن کا اجالا تھا لیکن کورے ڈور میں اندھیرے کے وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کرسیوں پر مجمع لگا ہوا تھا ایک آواز سنائی دی 'ہوں' تم نے اب دل کیوں نہیں جلایا روشنی کے لئے؟

قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن ان میں بخاری صاحب کے قہقہے کو صاف سن سکتی تھی۔ وہ اپنی کھرج دار آواز سے کس طرح الفاظ کو نکھار دیتے تھے۔ سانس کی رفتار اور مدھم کھرج لفظوں میں کس طرح زندگی پیدا کر دیتے تھے۔ انھیں اس پر کمال حاصل تھا۔ اگر آپ نے بھی "جمعہ خاں جمعہ" سنا ہو اس میں یا پھر مرثیے کی خواندگی میں وہ قیامت بپا کر دیتے تھے۔

ایک دن میں نے ریڈیو کھولا وہ میر انیس کا مرثیہ پڑھ رہے تھے اس وقت جناب زینب کے صاجزادوں عون و محمدؑ کی سواری کا مضمون تھا۔ انھوں نے حضرت زینب کے جذبات کو ضبط کرنے والے اشعار اس انداز سے پڑھے کہ سامعین کو حضرت بی بی کی اپنے صاجزادوں کو آخری سفر پر بھیجتے وقت کی تصویر دکھادی۔ لفظوں سے کھیلنا ہر عمر اور ہر سانحے کی تصویر کشی کوئی بخاری صاحب سے سیکھے۔

موسیقی سے دلچسپی بھی ان کی کمال کو پہنچی ہوئی تھی جس میں انھیں بہت درک حاصل تھا۔ انار کلی کے گانوں کی ریکارڈنگ انھوں نے کئی ہفتے پہلے سے شروع کرائی۔ انھوں نے حکم دیا کہ مجھے یہ کلام شاہانہ راگ میں چاہئے۔ مغل بشیران کے پسندیدہ آرٹسٹوں میں سے تھے۔ جب دیکھو

مغل بشیر کو لئے ڈرامے کے کمرے میں بیٹھے ہیں سہراب جی کی کمپنی نہیں یہ طرز نہیں بشیر وہ دوسری طرز سناؤ! میں ٹھیکا دیتا ہوں۔

ہاں آغا حشر کی یہودی کی لڑکی والا میوزک بجاؤ۔ کبھی بڑے آغا صاحب ان کے پاس بیٹھے ہیں اور ان کی پسند کو سراہ رہے ہیں۔ شاہد بھائی (شاہد احمد دہلوی) ان سے بہت گھبراتے تھے۔ کبھی وہ پروگرام ختم کر کے جاتے نظر پڑے تو وہ آواز دیتے شاہد صاحب شاہد صاحب! اور شاہد صاحب مڑ کر دیکھتے پروگرام ویسے شاہد صاحب نے ایس احمد کے نام کے کئی سال دیئے۔

"جی قبلہ فرمائیں! میں ذرا جلدی میں تھا"

شاہد صاحب آپ نے کھماج میں قینچی لگائی اور ۱۶ ماتروں میں ٹرخا گئے۔۔ ویسے بول تو آپ ہی کے تھے نا؟۔۔ وہ لاکھ سوال کر ڈالتے جیسے ایک ایک چیز خود سن کر آئے ہوں۔ میں نے شاہد صاحب کے چہرے پر کدورت دیکھی تو انھیں بتایا کہ بخاری صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لئے بہت سے راگوں کے بارے میں پوچھا کرتے ہیں آپ ناحق ملول ہوتے ہیں؟۔ ابھی اسی دن کی بات ہے کہ اسد علی خان سے کہہ رہے تھے کہ ارے میاں یہ علم سکھا جاؤ تم لوگ سینہ بہ سینہ یہ علم لے جاؤ گے؟ کچھ نوٹس بنانے چاہئیں میں نے چھوٹے آغا سے بھی کہا تھا کہ وہ یہ کام انجام دیں تاکہ یہ فن پھیلے اور باقی رہے۔ کیونکہ ایسی بخیلی اچھی نہیں ہوتی۔

بخاری صاحب نے مختلف خانے تیار رکھے تھے جن میں وہ اپنے پسندیدہ اشخاص کو رکھتے تھے۔ خوش گفتاری اور ہزار ہا اشعار ازبر ہونے کی وجہ سے ناصر جہاں ان کے پسندیدہ پروڈیوسروں میں تھے ناصر جہاں کو موقع بموقع سنانے کے لئے لاتعداد شعر یاد تھے وہ واقعی بے حد مہذب' اور شائستہ انسان تھا جسے اللہ تعالیٰ نے خوبصورت آواز بھی عطا کی تھی جیسی خدمت حاضر باش میں دلجوئی ناصر جہاں نے ان کی کی تھی کسی اور سے ایسی نہ ہو سکی۔ (آخری حصے میں ان کی ریکارڈنگ ناصر جہاں کرتے رہے)

ان کی نجی محفلوں کے حالات ناصر جہاں پر آشکارا تھے۔ وہ ان سب آلودگیوں کو جانتے تھے۔ بچپن کی چھپی ڈھکی مزاجی عادتوں کے پنپے ہوئے وہ عمر کے آخری حصے تک پہنچ چکے تھے اب بھلا کیا بدل سکتے تھے۔ وہ جو ہر انسان میں اک چھپا ہوا بچہ ہوتا ہے جس کا وہ ساری عمر قیدی رہتا ہے وہ بچہ بلبلاتا رہا۔ بخاری صاحب کی سحر انگیز شخصیت کے اندر اندھیروں میں وہ اس کے غلام تھے اور ایسے میں بہت سے رازداں بچے کبھی کبھی خلوت میں ایسے کھیل کھیلتے تھے۔ کچھ تو معاش کے لئے گئی

بندھی تنخواہوں کے عوض کچھ ان کی مقناطیسی شخصیت کے روبوٹ تھے۔(کچھ حضرات اب ایسے بڑھ چڑھ کر برائی کرتے ہیں جنھیں وہ دھتکار دیا کرتے ہیں)۔

جہاں بخاری صاحب نے پھلوں' میووں اور کھانے کی بھری میز سے میز پوش اٹھائے ہاتھوں میں مے وساغر چھلک اٹھے اور یہ بیخودی سالہا سال چلتی رہتی کہاں کہاں سے آوازیں اور ساز ڈھونڈ کر لاتے محنت کرتے انھیں جلا بخشتے اب یہ اپنا اپنا ظرف کہ وہ کہاں تک ان کے ساتھ جاتے۔ ان میں بہت سے ایسے نام ہیں جو واقعی وہی چھوڑ گئے۔ سلیم گیلانی ان سے اچھا کوئی پروڈیوسر نہیں نکلا۔ سلیم سے بہت سے چراغ جلے۔ مہدی حسن' غلام علی' شہناز' رشماں یہ سب تو میری آنکھوں کے سامنے کی شخصیت ہیں۔ دوسرا نام ناصر جہاں کا ہے دونوں ہی بڑے سعادت منداور ان کے شاگرد رہے۔ دلی کے زمانے کے پروڈیوسروں میں پطرس اور ذوالفقار بخاری کی ٹرینگ کے اعجاز بٹالوی' ضیاء جالندھری' حمید نسیم اور الطاف گوہر ہیں جو اچھے پروڈیوسر بنے۔ بخاری صاحب کو "تراشیدم" کی زندگی بھر تکلیف رہی۔ پرستم ذرا مشکل کھیر تھی ہاں نکلستم بڑے شوق سے کیا کرتے تھے۔ نہال عبدا کی مثال موجود ہے کیا کیا نہ کیا ان کے لئے۔۔ مس علی کو بھی وہی عظمت بخشی۔ محمد علی کو واقعی تراشا دلیپ شو میں تو حیران رہ گئی۔ کیا خوبصورت شعر پڑھے۔ ٹیسپ کا بند بالکل ویسے ہی اٹھاتے تھے الفاظ کی خوبصورتی کا نکھار کیسے کیسے ادا کر رہے تھے محمد علی نے محنت سے سیکھا ہے ڈلیوری بڑی کامیاب رہی میں تو واقعی حیران تھی ایک کاپی کرنا کسی کو آسان نہیں۔ بخاری صاحب نے ریکس ہیریسن Rex Hareson کی ایسی ہی بہترین کاپی کی۔ وہ بھی چاہتے تھے جن جن کو وہ سکھاتے تھے وہ سب ہی تو اچھے آرٹسٹ نہیں نکلے۔ محمود علی نے جتنی قربت بخاری صاحب سے حاصل کی۔ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ مگر بہت ہی کم ان کو حاصل ہو سکی بمبئی سے کراچی کے بہت سے سال انہوں نے ناشتے کھانے سے لے کر گھر کے اندرونی تمام معمولات کے کرتا دھرتا وہی تھے یعنی ریڈیو کے محمود علی۔

ایک صبح ریڈیو کی ٹرانسکرپشن سروس کے کمرے میں نڈھال سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ آنسو خشک ہو چکے تھے استاد کا انتقال ہوا تھا اسی صبح کو مجھے دیکھا چپ رہے پھر بولے ایک اور اچھی آواز اللہ میاں نے چھین لی۔ استاد کا انتقال ہو گیا ہائے ہائے اور مہدی حسن کو بلاؤ پنڈت کو بلاؤ کیا حال ہو گا۔ ایسا حسین آدمی چلا گیا وہ ان کا آخری پروگرام تھا۔ ناصر جہاں نے جلدی سے ریکارڈنگ کا انتظام کیا لکھنا نہیں چاہتے میں نے زبردستی قلم کاغذ دیئے کہ لکھیے۔ وہ آخری ریکارڈنگ آخری

تحریر، کیا اچھا اسکرپٹ لکھا۔ انشاجی اب کوچ کرو۔ ہم سب سنتے ہیں۔

اتنے عرصہ لندن میں رہ کر جب ڈھیر ساری فلمیں دیکھنے کو ملیں تو ہلکے ہلکے اندازہ ہوا کہ کون کون سے ایکٹر اچھے ہیں۔ کچھ فلمیں پاکستان میں دیکھتے رہے اپنے لڑکپن سے جوانی تک۔ لندن میں ایک ایسا ایکٹر دیکھ کر مجھے بخاری صاحب یاد آئے ریکس ہیری سن (RexHarrison) اس کی آہستہ آہستہ لفظ بولنے کی ادائیگی میں علیحدہ علیحدہ آوازیں نکالنے کا جنون تک خبط ہے My Fair Lady کئی بار دیکھا اور بخاری صاحب یاد آجاتے تھے۔ بخاری صاحب کا آئیڈیل بھی Rex Harrison ہو گا۔ ویسے سنا ہے عادات و اطوار بھی ان ہی جیسے تھے۔ اگر زندگی وفا کرے اور باہر جائیں تو سنڈے بلڈی سنڈے (Sunday, BloodySunday) ضرور دیکھیں۔ RexHarrison اور Gilanda jackson کی یہ غضب کی فلمیں ہیں۔ ہاتھوں کا اسٹائل۔ آوازیں نکالنا۔ کھرج سے کام لینا۔ لفظوں کو علیحدہ علیحدہ ٹانک دینا اور سانس کو اپنے اختیار میں رکھنا بخاری صاحب نے انہیں سے سیکھا ہو گا۔ پطرس بخاری نے ہمیں کلاسوں میں بتایا تھا کہ آواز Air پر جاتے ہوئے آخری لفظ کا سانس نہ ٹوٹے۔ آخری لفظ دور پہنچ نہیں سکتے۔ اسی لئے یہ لوگ چپکے سے نیا سانس ایسے لے لیتے ہیں آخری فقرے تک۔ تاکہ دور دراز ملکوں میں آواز کے آخری لفظ بھی سمجھ میں آجائیں جس کو باہر کی زبان میں Clearity کہتے ہیں۔ یہی براڈ کاسٹنگ کی خوبصورتی کہلاتی ہے۔ پطرس بخاری اور زیڈ اے بخاری صاحبان نے ہمیشہ یہی کہا۔ شکسپیرین ایسے ہی بولتے ہیں۔ اتنے بہت سے ڈرامہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ بھی بڑا اوکھا کام ہے۔ اور جواب ہمارے اس بڑھاپے کی منزل میں سارے اصول جگمگا رہے ہیں، بخاری صاحب تو بادشاہ تھے براڈ کاسٹنگ کے۔ دنیا ان کو چاہتی تھی اور وہ بھی بہت سوں کو چاہتے تھے۔ پپو۔ ڈاڈا اور ٹمی یہ تینوں ان کی بیٹیاں تھیں۔ مگر باپ بیٹیوں کی راہیں بہت مختلف تھیں باپ کی چاہت میں بہت سی ہستیاں مخل ہوتی رہیں۔ بخاری صاحب کی چاہت ہمیشہ بازی لے جاتی رہی۔ سب سے پہلی چاہت جب بخاری صاحب کے گھر میں داخل ہوئی وہ شمس عارف تھے۔ سنا ہے ان کی چاہت کی خاطر بچیوں کو اپنے ماموں نصیب ہوئے۔ بخاری صاحب کے جھولے میں بہت سے نام تراشے ہوئے بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں تراشنے کا زندگی بھر شوق رہا۔ مگر کچھ نام واقعی انسیت لئے ہوئے ہیں جو ان کی آخرت تک ساتھ رہے ان میں ناصر جہاں۔ سلیم گیلانی۔ محمد اور جعفری وغیرہ وغیرہ۔ ناصر جہاں کو تو بہت چاہتے تھے اور واقعی

انہوں نے بھی حق ادا کر دیا۔ میر تقی میر کے شعروں سے ناصر جہاں اکثر شامیں محفلیں سجاتے۔ براق سی چاندنی پر قالین گاؤ تکیہ لگا کر موتیا کے پھولوں کے گجروں سے۔ شمع کی مدھم روشنیوں میں۔ وہ ذہین دماغ چہرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر سجاتے۔ شعروں کے انتخاب سے ذہنی رسوائیوں کے راستوں پہ چپکے چپکے کتنے مختلف اسکولوں کے منفرد اشخاص کا پتہ لگا لیتے تھے۔ ان کی شامیں تو بج جاتی تھیں مگر یہ ان کے ٹیلنٹ ڈھونڈنے کا چھپا ڈھکا طریقہ تھا۔ ذہنی خزانوں کا وہ بھی اس طرح پتہ لگا لیتے پھر وہ ان کو قلم اور مائیکروفون دے دیتے۔ کوئی سوچ سکتا ہے ایسا انداز۔ ان میں سے کچھ نام اگر نہ لوں تو ناانصافی ہو گی۔ اعجاز بٹالوی' ضیاء جالندھری' حمید نسیم' الطاف گوہر یہ سب اور بہت سے لوگ جنہیں انہوں نے تراشا جو اپنی آوازوں اور لوح و قلم سے اب تک روشن ہیں۔

آخری دنوں میں ایک دن میری آنکھوں نے دیکھا ایسے بھرے شیر کو جو غصہ میں اسٹوڈیو میں جب آتا تو اچھے اچھوں کو میں نے گھبراتے خاموش دیکھا مگر وہی شخص جب اس کے پاس اقتدار نہیں سادہ شخص اپنی سونی محفلوں سے گھبرا کر ریڈیو آجاتا تو لوگ پیچھے سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے بخاری صاحب سے پہلے ہی اپنے کمروں ہیں سرک جاتے اپنے اقتدار کی کرسیوں تک۔

ارے بھئی مصیبت آ گئی۔ میں نے خود سنا۔ وہ لوگ جو بول نہیں سکتے تھے بخاری صاحب کے سامنے۔ صرف ناصر جہاں ہی ایک ایسا شخص تھا جو آیئے قبلہ و کعبہ کہتے ہاتھوں ہاتھ لے جاتا اسٹوڈیو میں۔ امانت علی خاں کی موت کی خبر صبح کے اخبار میں پڑھ کر جانتے ہوئے کہ ان کا کوئی تعلق نہیں وہ اداس سوجی آنکھوں کے ساتھ صبح ہی صبح ریڈیو آ گئے۔ جو صاحب اسٹیشن ڈائریکٹر تھے اس زمانے میں انہوں نے دیکھا چک کے اندر سے اور کہا لو بھئی وہ مصیبت آئی۔ سنئے بھئی آرٹسٹوں کو بلا کر چپکے چپکے ریکارڈنگ کروالیں ان کو خبر نہ کریں ورنہ صبح سے شام ہو جائے گی تعزیت کے پروگرام میں یہ اپنی ٹانگ اڑائیں گے۔

بخاری صاحب کے لئے وہ الفاظ میں نہ سن سکی! ارے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پروگرام اچھا ہو جائے گا۔ آپ میوزک تو نہیں جانتے۔ بی بی سی کے تین سال کے پروگرام نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ امانت علی کو آپ بخاری صاحب سے زیادہ کیسے جانتے ہیں۔ پھر میں اپنی اوقات سمجھ کر چپ ہو گئی میرے پاس سوائے سینیارٹی کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ میں کہاں اور اسٹیشن ڈائریکٹر کہاں۔ میرا لحاظ کرتے تھے میری آواز سنتے ہی چک کے اندر آنسوؤں سے بھری سوجی آنکھیں تھیں۔ ہائے میرا شہزادہ چلا گیا۔ ایسا گئی۔ خوبصورت گلے والا شہزادہ امانت کہاں سے آئے گا۔ پھر

وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئے۔ میز کی دوسری طرف ایک منھی کھلے منہ کا اسٹیشن ڈائریکٹر کی طرف حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ارے لوگو! وہ میز پر مکہ مار کر بولے پنڈت کو بلاؤ۔ مہدی کو بلاؤ۔ امراؤ کو بلاؤ۔ اب کہاں ایسی آوازیں سنیں گے۔

اور اتنی دیر میں ناصر جہاں اور جعفری ان کو پکڑ کر ٹرانسکرپشن سروس کے اسٹوڈیو میں لے گئے۔

میز پر بانہیں پھیلائے ململ کی آستینوں سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ روتے رہے۔ یہ آرزو تھی تجھے گل کی روبرو کرتے۔ وہ اپنی جگمگاتی غم میں ڈوبی گہری آواز سے میرا دل نوچ رہے تھے۔ نوحہ خواں ہم تین تھے۔ جعفری۔ ناصر جہاں اور میں۔ میں نے ایک قلم اور کفن جیسا کاغذ کا ایک پیڈ ان کے پاس کھسکا دیا۔ ہاتھ میں قلم رکھ دیا۔ راگوں کے بادشاہ کے پاس "لکھئے بخاری صاحب غزلوں کے شہزادوں کے لئے کچھ شعر۔"

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

اور غموں کا لاوا بہتا گیا۔ بہتا گیا۔ بخاری صاحب آپ جیسا کہاں سے لاؤں۔
کہ تجھ سا کہیں جسے۔ آپ کا بنایا ہوا گھوڑوں کا اصطبل جسے آپ نے ریڈیو پاکستان بنایا تھا اب واقعی اصطبل رہ گیا ہے ہمارے قدم بھی نہیں اٹھتے اب اس طرف۔

محمود نظامی

قتالہ عالم سنتوش رسل' پشاور کی ڈراما آرٹسٹ جب اس روز اسٹوڈیو میں پہنچی۔ بقول بعض ڈراما آرٹسٹوں کے نمک 'کی کام تھیں "توشی بیگم" ۔۔اور ہم دونوں اسی روز ایک دوسرے کو دیکھ کر زور سے ہنس پڑے تھے۔ نظامی صاحب کی حیرت "توشی" کے موتیوں جیسے دانتوں میں گڑ گئی تو مجھے ہوش آیا کہ یہ نظامی صاحب کا پہلا واقعہ ہے (بے تکلف حسینہ سے ملاقات کا)۔ یہ عجیب چیز ان کے چہرے پر میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ کیا ہوا؟.... نظامی صاحب آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔۔۔ سنئے! آخر آپ ان کا تعارف ایسے کیوں کرا رہے ہیں۔ پھر اس لڑکی سے۔ ارے بولتی کیوں نہیں "توشی"؟ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ پھر کھلکھلا پڑی۔ جیسے یہ خوشی وہ ان سے چھپا رہی ہو۔ وہ ان سب کی توجہ انجوائے کر رہی تھی کہ میں نے یہ سب کھیل ختم کر دیا۔ کچھ چہروں پر سلوٹیں پڑیں اور کچھ اچانک میری آمد سے چمک اٹھے۔ میں پورے وقت سوچتی رہی کہ نظامی صاحب اپنے اصلی رنگ میں کیوں نہیں واپس آتے۔ آخر کیا وجہ ہے۔ اور میں نے کہہ دیا کہ ۔۔ آخر نظامی صاحب آپ کو کیا ہوا؟۔ آپ سب خدا کے لئے موسم کی خرابی اور سیاست قسم کا موڈ ختم کیجئے۔ آپ کے سوچنے سے فلمی دنیا کا ماحول سنتوش کے جانے سے اچھا بننے سے رہا۔۔۔ اب آپ لوگ ویسے ہی ہلکے پھلکے دماغوں سے مجھ سے بات کیجئے۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ میں جاتی ہوں۔ بھائی..... بھائی.... ارے بھائی.... سنو! ارے اہل قوم پہ مصیبت نازل ہو گئی 'اس کو سہو۔ اور خدنہ پیشانی سے ۔۔ اور سب ہنس پڑے۔

ہم غریبوں میں کب اتنی جان ہے۔ یہ مصیبت تو آدم سہہ گیا۔ اللہ و غنی اور ایک دفعہ پھر وہ بچوں

جیسی مسکراہٹ جو نظامی صاحب کا حسن تھا' وہ شگفتگی جسے میں نظامی صاحب کہتی تھی' وہ واپس آ گئی۔ اور دوپہر کے دو بجے سے پانچ بجے تک وہ ان کی مسلسل تیز تیز باتیں۔۔۔ وہ لطیفے۔۔ وہ قہقہے جو نظامی صاحب کی کمپنی میں گیا۔۔۔ کچھ تو ہنستے ہنستے میرے جیسے فربہ اندام ہوئے۔۔۔ اور کچھ عشرت رحمانی کی طرح سوکھے درخت کی مانند ہو گئے۔ (بقول نظامی صاحب)

میں اکثر ان کے لطیفے سنتے سنتے سوچتی تھی کہ کتنا تیز بولتے ہیں۔ اور لفظ غلط نہیں ہوتے۔ وہ گول گول سا معصوم سا چہرہ دیکھتی رہتی۔ اور لطیفے کے ختم ہونے پر میں سب کے ہنسنے کے بعد ہنس پڑتی۔ مگر وہ فوراً سمجھ جاتے۔ ارے لڑکی۔ یہ ہمارے ساتھ بھی بے ایمانی۔۔ ایک دن ان کے سر پر دھوپ کی تیزی سے قطرے جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور سر کے سطح اتنی چمکدار۔۔ نرم۔۔ اور ان کے چہرے سے زیادہ اجلی تھی۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔۔ بھائی اب وہاں کے متعلق کیا سوچنا۔۔ تم لوگوں کی سوچ نے۔۔ اس نوبت کو لا دیا۔۔۔ اور میں سخت شرمندہ ہوئی۔۔ تو۔۔۔ خوب زور سے ہنسے۔۔ ارے بھئی لوگو۔۔ یہ سحاب شرمندہ ہوتی ہے تو عورت لگتی ہے۔ خدا کی قسم۔ میرا گنجا سر دیکھ رہی تھی غور سے۔ اور آپ حضرات لطیفے بازی میں لگے ہوئے تھے۔

ایک صبح دھوپ میں' لاہور ریڈیو اسٹیشن کے لان پر گلاب کا پھول کوٹ میں لگائے ٹہل رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ ریڈیو اسٹیشن کے پیچھے رہتے تھے۔ صبح صبح جلدی آجاتے۔ جو پروڈیوسر آتا۔۔۔ مسکراتے اور سارا دن ہر دیر سے آنے والے سے کہتے۔ حضرت آپ لیٹ ہیں۔ چائے آپ پر ہو گئی۔ دھوپ کی تیزی سے ان کے سر کی چمکدار سطح اتنی چمکدار اور نرم ہو گئی تھی اور میری نگاہیں پھر ان کی "گنجی چندیا" پر تھیں۔ نظریں ملتے ہی انہوں نے میری ہچکچاہٹ سے فائدہ اٹھایا۔ جب قہقہے اور بڑھے تو میں نے بھی صاف کہہ دیا کہ نظامی صاحب سچ کہتی ہوں کہ میں یہ سوچ رہی تھی کہ آپ کو سردی گرمی سے ہی شدت سے محسوس ہوتی ہو گی۔ اور دیکھئے چہرے کی رنگت میں اور سر کی کھال میں کتنا فرق ہے۔ آپ کتنے گورے ہیں اوپر سے۔ تو وہ اور ہنسے۔ بولے۔ بھائی یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں غریب تو ہر چیز میں لطف لینے کا عادی ہوں۔ ہمارے حفیظ جالندھری صاحب نے ایک دن شکایت کی' جب ہم دونوں ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ غسل خانے سے آئے اور بولے۔ یار نظامی! بھائی یہ بتاؤ کہ ٹرین کا آئینہ چھوٹا ہے میرے قد سے۔ منہ تو دھو لیا۔ اب صابن جو لگایا تھا' وہ نہ جانے چہرے کی حدود سے گزر کر کس مقام پر ختم ہوا ہے۔ مجھے

تو معلوم نہیں۔ تم ذرا دیکھ کر بتاؤ صابن کہاں تک لگا ہے۔ ہم سب کا برا حال تھا ہنس ہنس کر۔ وہ خود کبھی لطیفہ سناتے وقت نہیں ہنستے تھے اور وہ چپ چاپ کھڑے یہ دیکھتے تھے کہ لوگ کیسی کیسی شکلیں بنا کر ہنستے ہیں۔

اس لطیفے سے مجھے یاد آیا کہ جب میں نے ۱۹۴۲ء میں دلی ریڈیو پر پہلی دفعہ کام کرنا شروع کیا اور نظامی صاحب کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ نظامی صاحب ایک چھوٹا سا کوٹ پہنے اور سر پر براؤن رنگ کی قراقلی ٹوپی پہنے، جس کی لمبان بہت کم ہوتی ہے۔ گاندھی کیپ جیسی۔ اس زمانے میں نظامی صاحب بھی دبلے پتلے تھے اور چھوٹے سے لگتے تھے۔ میرا فوجی پروگرام کے لئے آڈیشن ہونے والا تھا۔ مجھے ایک روز مرزا صاحب نے بلایا تھا۔ ان سے ملو سحاب۔ یہ ہیں نظامی صاحب۔ ہمارے فوجی بھائیوں کے پروگرام کے انچارج۔ ان کے ہاتھوں میں انٹرویو کے کاغذات تھے۔ بڑے غور سے پڑھ رہے تھے۔ انہیں جلدی سے میز پر رکھ دیا۔ ارے کیا کہا۔ پھر سے کہئے۔ یہ کون ہیں۔ اور ان کا منہ پھولا ہوا تھا۔

مرزا صاحب اپنے ٹوٹے پھوٹے قہقہوں کو جوڑتے ہوئے، بڑے سے پیٹ پر پتلون چڑھاتے ہوئے بولے۔ یہ ہمارے پروگرام کی اناؤنسر ہیں۔ سحاب قزلباش۔ اے کلاس وائس۔(Voece A Class)۔ وہ اچھل پڑے۔ ارے مرزا صاحب خدا کا خوف کرو۔ یہ چھوٹی سی لڑکی پروگرام کی اناؤنسری کرے گی۔ بھائی وہ غریب جنگ پر جو فوجی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو انہیں اپنے ملک کی عورت کی آواز ہی سننے کو مل جائے۔ ہم بچوں کا پروگرام تو ان کے لئے نہیں پیش کر رہے۔ اور وہ مجھے پہلی بار زہر لگے۔ لو۔ یہ تو مجھے رکھیں گے ہی نہیں۔ سارے لوگ تو اتنی تعریف کر رہے تھے۔ میری آواز کی۔ اور میں جل کر خاک ہو گئی۔ مرزا صاحب نے کہا: میں مائیک آن کرتا ہوں۔ آپ آنکھ بند کر کے سنئے۔ یہ آواز عورت ہی کی ہے۔ اور مجھے پکڑ کر اسٹوڈیو میں لے گئے۔ اسٹوڈیو سے جب میں ڈرتی ہوئی باہر آئی تو وہ اپنی پوری آنکھیں کھولے ہوئے دیکھ رہے تھے جہاں تک وہ کھول سکتے تھے۔ واہ بھئی وا۔ خوب صاحبزادی! آواز تو تمہاری بڑی کلچرڈ ہے۔ تمہاری عمر کیا ہے؟.... کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟۔۔۔ اور پھر وہ پنجابی میں شروع ہو گئے۔ ایس کڑی دی ریکارڈنگ سویر نوں ہوئے گی۔ شام نوں نہیں۔ کون دیکھے گا۔ حفاظت کون کرے گا ایدی۔ وہ یہ سب ایک سیکنڈ میں بول گئے۔ اور میں نے سوچا کتنا تیز بولتے ہیں یہ۔ اور لفظ کوئی غلط نہیں نکلتا۔

اور ایک دن جب میں آپا (مسز نظامی) سے ملی مجھے یقین نہیں آیا۔ جیسے وہ دونوں بہن بھائی ہوں۔ بہت گہرے دوست ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہی امپریشن جو نظامی صاحب کے چہرے پر ہوتا۔ وہی بات کرنے کا اتار چڑھاؤ۔ سارے ہی رخ مسز نظامی یا نظامی صاحب کی آپا نے چرا لئے تھے۔ یا نظامی صاحب نے۔ کیا میاں بیوی بھی اتنے اچھے دوست ہو سکتے ہیں اور اس دوستی پر تو شاید آج کی ہر عورت جل اٹھے۔

یہ وہی نظامی صاحب تھے۔ جو کراچی میں میرے گھر جمشید روڈ پر میرا پتا ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ گئے تھے۔ "ہائے نظامی صاحب۔ آپ؟"... اور میں خوشی سے لپٹ گئی۔ "اتنے ڈھیر سے دنوں کے بعد آپ کو دیکھا۔"

"دیکھو لڑکی!..... تم چاہے کسی بھی نیول افسر کی بیوی ہو۔ میرے لئے تو وہی سحاب ہو۔ جو فوجیوں کا پروگرام دلی سے کیا کرتی تھی۔ تمہاری ضرورت ہے۔ تم اٹھو۔ ابھی چلو میرے ساتھ۔ انٹیلیجنس اسکول۔ پاکستان تو بن گیا۔ مگر جناب والا۔ کراچی میں کوی ریڈیو اسٹیشن کے لئے بلڈنگ نہیں۔ ریڈیو اسٹیشن کراچی میں بنانا ہے۔ آپ کا دفتر بھی ٹینٹ میں اور اسٹوڈیو بھی ٹینٹ میں ہے۔ نہ تنخواہ ملے گی نہ کوئی اور لوازمات۔ کچھ دن تک اٹونمنٹ کرنی ہوگی۔ جو بھی وہ کام دیں۔ اسٹیشن چلانا ہے کیا سمجھیں۔ چلو۔ جلدی اٹھو"۔ اور میں ان کے جملوں کی تیزی کی تاب نہ لا سکی۔ اور ایک پرچہ نیوی کے افسر کے نام لکھ کر خانساماں کو دیا اور ان کی گاڑی میں چل دی۔ میں خود ہواؤں کی گود میں اڑ رہی تھی۔ آج میں کراچی سے بھی براڈکاسٹ کروں گی۔ نیوی کے افسر کے ساتھ شادی کے کونٹریکٹ میں یہی طے ہوا تھا کہ میں کبھی ریڈیو نہیں جاؤں گی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ کتنی بڑی قربانی تھی۔ خوابوں میں براڈکاسٹ کرتی رہتی۔ کبھی لائٹ چلی جاتی، کبھی کوئی اور خرابی ہو جاتی۔ اور میں اپنی آواز ہواؤں کے دوش پر نہ پھیلا سکتی اور ہر صبح آزردہ اور تشنہ اٹھتی۔ جیسے کوئی چیز چھن گئی ہو مجھ سے۔ کہاں آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیو چھوڑ کر آئی۔ جو خوابوں میں ویسے ہی جگمگاتے مجھے بلاتے رہتے۔ اور ادھر خیموں کا شہر دیکھ کر میں چپ چاپ کھڑی تھی۔ ہمارے پاس تو حصے میں کچھ بھی نہ آیا۔ مگر وہ کیا جذبہ تھا جس سے ہم سب حرکت میں آ گئے۔ قلم، دواتیں، کاغذات، پنسلیں، اس زمانے میں گھروں گھروں سے مانگتے۔ ٹینٹوں میں ایک دو میزیں پڑی رہتیں جن پر سب لوگ بیٹھ کر، کھڑے ہو کر اپنے اپنے پروگرام لکھتے۔ ریہرسلیں کرواتے۔ اور پورا یونٹ کیسے خوشی خوشی پروگرام کرتا۔ "ماجد" جو اس زمانے کا ہیرو

تھا۔ کیا اچھا بولتا تھا۔ کیسا سمجھوتا تھا۔ کیسا اعتماد تھا۔ محبتیں تھیں۔ کیسی زندگیاں تھیں۔ جو ملک سنوارنے میں گزر رہی تھیں۔ سب ہی ایک حمام میں تھے اپنی اپنی ڈفلی۔ اپنا اپنا راگ الاپنا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سب کی ایک زبان تھی۔ عقیدت کا ایک مرکز تھا۔۔ اور سب پاکستانی تھے۔۔۔ بارشیں جب پڑنے لگیں اور ٹینٹوں میں میزوں کے نیچے جب پانی جمع ہونا شروع ہوا تو بجلی کے تاروں کا اثر لوگوں کے جسموں تک پہنچنے لگا۔ زندگی موت کا ڈر تھوڑی دیر کے لئے سہا دیتا تو کسی ٹینٹ کے کونے سے جھانکتا ہوا نظامی صاحب کا چہرہ، تیزی سے سب کو منع کرتا ہوا نظر آتا۔۔۔ اودے دیکھ کے۔۔۔ اوئے بادشاہو۔ تواڈا وقت نہیں آیا۔ اور ماجد تو بالکل ہی والنیٹر بن گئے تھے۔ آنے جانے والوں کو میزوں پر سے کدواتے ہوئے اسٹوڈیو تک پہنچا رہے تھے۔ اور پروگرام ایر پر جاتا رہا۔ دن بھر کی تھکن نظامی صاحب کے لطیفوں سے دور ہو جاتی۔ مجھے دیکھتے ہی ایک دن کہا۔ سحاب ایک لطیفہ سن لو۔ تیرے واسطے ہے۔ دگل نے لاہور اسٹیشن پہ ایک آرڈر دیا کہ آرٹسٹ کو اناؤنسمنٹ کے بعد Fade in کیا جائے۔ اتفاق سے میں گیا۔ وہ بڑا پیانو اسٹوڈیو میں رکھا ہے۔ اس کے نیچے سے زینت بیگم جو تمہاری طرح ہیں۔ بڑی مشکل سے پیانو کے نیچے سے نکل کر آ رہی تھیں۔ سانس پھولا ہوا۔ پسینے پسینے۔ میں بوتھ میں کھڑا حیران دیکھ رہا تھا۔ اناؤنسر کہہ چکا تھا۔ زینت بیگم سے گیت سنئے۔ اور یہ بڑی مشکل سے مائیک تک پہنچیں اور پھولے سانس سے آواز آئی۔ ساجن کب گھر آؤ گے۔۔" میں نے اناؤنسر سے پوچھا۔ یہ کیا تماشا ہے۔ اس نے ٹائپ کیا ہوا ایک نوٹ دکھایا "Artist should be fade in" سب ہنس رہے تھے اس لطیفے کے دوران میزوں پر سے تم بھی Fade in نہ ہونا۔ کیسے شگفتہ تھے نظامی صاحب۔ اور میرے سارے پاکستان سجانے والے کہاں کھوتے جا رہے ہیں۔ اور ہم سب کا دوست 'براڈ کاسٹنگ کا بادشاہ۔ زیڈ۔ اے۔ بخاری۔ بندر روڈ پر گھوڑوں کے اصطبل کے اندر غیر ملکی انجینئروں کے دماغوں سے جلدی جلدی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اور اپنے خادمان قوم کو صرف ہیا ہو۔ ہیا ہو' کہنے کی دیر رہتی۔ اور سارا کام ہمارے پاکستانی انجینئر کھٹاک کھٹاک اپنے کاندھوں پر اٹھا رہے تھے۔ نظامی صاحب۔ راشد صاحب۔ فرید صاحب سارے پرانے اسٹیشن ڈائریکٹر ایسے کھڑے کھڑے کام کر رہے تھے جیسے ایک خاندان کے سب لوگ اپنا گھر بنا رہے ہیں۔ ہنسی خوشی۔ آج جب میں یہ سوچتی ہوں ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے جو اپنے اقتدار کو ہمیشہ ہی نہیں اوڑھے رہتے تھے دوستوں کی طرح گلے بھی لگا لیتے تھے۔ چھوٹائی بڑائی کا کوئی احساس نہیں تھا۔

فن کے آگے جھکتے تھے اور فن کی عزت کرتے تھے۔ جس میں افسری ماتحتی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔
اور جو کل شام کو میں شمع جلا رہی تھی سفید کپڑوں میں میں خود اپنے آپ کو مقدس لگ رہی تھی۔ اور یاد کر رہی تھی کہ اب جو فاتحہ دوں گی باباجان کی روح کے لئے اور اپنے میاں کی ماں کی روح کے لئے تو آیت تو یاد کر لوں۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ جہاں آرا سعید تھیں۔ ریڈیو کی نیوز کی اناؤنسر۔ میں نے کہا کہ فاتحہ کی تیاری کر رہی ہوں۔ آج شب برات ہے نا۔۔۔ بولیں تم نے کچھ سنا۔۔ کیا؟... وہ جو نظامی صاحب ہے نا... ہاں ہاں.... میرے پیارے نظامی صاحب گپو گپو جو تھے.... ہاں ہاں تھے؟.... بولو.... اجی سحاب انو اتنے پیارے تھے کہ میرے تنخواہ کے لئے دفتر گئے اور میرے لئے لڑائی کی تھی۔ ڈپٹی ڈائریکٹر تھے نا۔۔۔ اجی سحاب: انو آج دوپہر کے دو بجے انتقال کر گئے۔ انو کو ایک دم سکتہ ہو گیا۔ بول ہی نہ پائے۔ اور میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ نہ کچھ سوچ سکی۔ انتقال۔ میرے نظامی صاحب۔ میرے عزیز نظامی صاحب۔ آپ کے نام کی شمع کیسے جلاؤں؟....
اور جب میں فاتحہ پڑھ رہی تھی تو اللہ میاں کو بھی یقین نہ ہوا ہو گا۔ میری فاتحہ ان تک پہنچی بھی یا نہیں۔ کیونکہ میں نے سنا وہ محبت کا مجسمہ، آپا بھی اب ساری زندگی موت کا یقین مٹا چکی۔ شمع کی لرزتی ہوئی روشنی میں وہ چمکدار آنکھیں۔ وہ روشن چہرہ۔ جو مجھے ابھی کچھ دن ہوئے نظر آیا تھا۔ میری لندن سے واپسی پر۔۔۔۔ بازار میں ملے تھے اور ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ خدا نہ کرے۔ میری توبہ ہے توبہ۔ یہ کہیں غلطی سے سحاب تو نہیں۔ اللہ نہ کرے۔ یہ کہیں سحاب تو نہیں۔ اب کہاں تک یہ تمہاری کھال کھینچے گی۔ اور کتنی موٹی ہو گی۔ اور میں ان کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا کہ آپ بھی اپنے پیٹ کی خبر لیں۔ اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

عصمت آپا
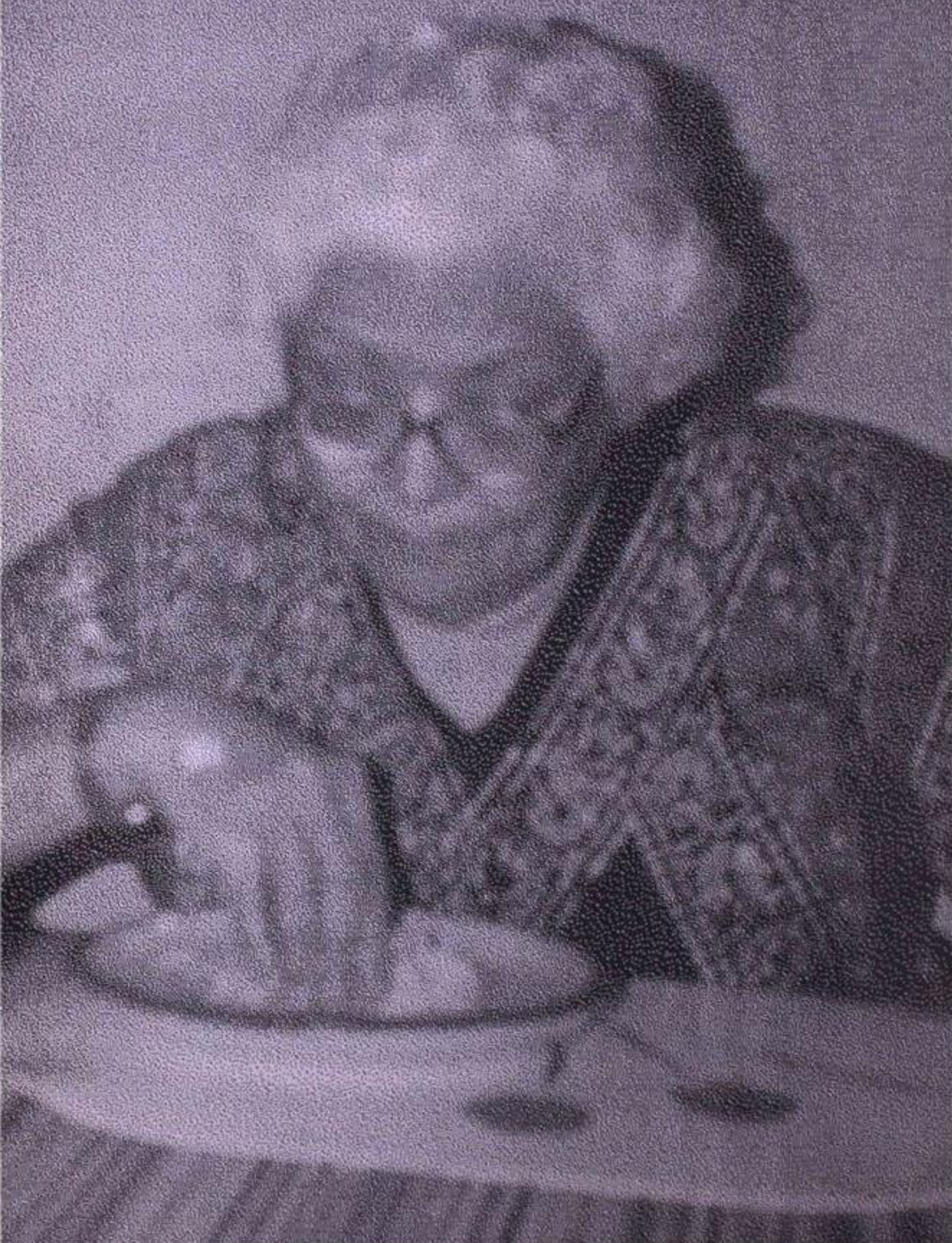
میری عصمت آپا

لندن کی اس ٹھٹھری رات میں فاخر حسین کے گھر کھانے پر عینی کے پاس بیٹھے میں اور فروز مکرجی نہ جانے کیسے عصمت آپا کا ذکر لے بیٹھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کی بڑی لڑکی کو عصمت کتنا چاہتی تھیں ایک زمانے میں بمبئی میں جب وہ دس گیارہ سال کی تھیں۔ اب کے جب میں بمبئی گئی تو میری آخری ملاقات تھی۔ چرچ گیٹ کے فلیٹ کے باہر سنہری پیتل کے لفظوں سے "شاہد لطیف" کی پلیٹ دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آئی۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے عصمت آپا سے شکوہ کیا آج تو بڑا نام چمک رہا ہے فلیٹ کے باہر "شاہد لطیف" میاں کا نام جو اب نہیں کیسے لکھ دیا فلیٹ کے باہر۔۔ ہاں کیوں نہ لکھتی اب کوئی وہ زندہ ہیں جو خوش ہوتے نہ وہ اب ہم سے فلیٹ مانگے نہ بیچنے کے لئے پیچھے پڑیں گے بھئی یہ ہمارے پیسوں کا ہے میری کہانیوں کے پیسوں کا۔ ساری چیزیں اڑا دیں انہوں نے ایک فلیٹ ہی رہ گیا تھا۔ ان کی سنتی تو آج بیٹھنے کی جگہ بھی نہ رہتی۔ یہ ہماری ضد کام آگئی تھی ان پیسوں پر ان کا کیا حق اور ساری کہانیوں کے ڈائیلاگ کے پیسے تھے۔ بمبئی کے ایک اندھیرے سے کمرے میں سیدھے ہاتھ پر زمین پر گدا بچھائے ان کی خوش شکل چھوٹی بیٹی ٹانگوں پر پٹیاں باندھے لیٹی ہوئی تھی۔ پیروں سے لے کر کمر تک۔ اور میں سہم گئی۔ کیا ہوا ان کو عصمت آپا۔

اے ہے کچھ نہیں بی بی۔ یہ ایک سرجری میں کام کرتی ہیں ایک بڈھے ڈاکٹر کے پاس۔ جب کوئی نگوڑا مارا مریض نہیں آیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کی ٹانگوں کو تراش دیا ان کو مہینوں سے شوق تھا فیشن کی ان کو بہت مصیبت ہے۔ پلاسٹر سرجری کا یہ بمبئی کا مشہور ڈاکٹر ہے۔ رانوں کو چھلوا

آئی۔ اب رونے دھونے سے کیا ہو سکتا ہے۔ تکلیف تو ہوگی۔ آخر کیا مصیبت تھی اب ٹانگیں Shape شیپ میں ہو گئیں تو دکھیا دکھیا اس میں پڑی کراہ رہی ہیں۔

بیٹی مسکراتی رہی خوش مزاج خوش شکل ہے ان کی چھوٹی بیٹی میں نے سوچا بڑی لڑکی کا دبلا پتلا لڑکا مجھے دیکھنے کے لئے آ کھڑا ہوا۔ آؤ یہ ہماری دوست ہیں لندن سے آئی ہیں ان کے گھر بھی ہم رہے تھے۔ منوں کے گھر سے ان کے گھر چلے گئے تھے یہ میری بڑی لڑکی کا لڑکا ہے۔ وہ میری نظریں پڑتے ہی واپس کمرے میں چلا گیا۔ نہ جانے کتنے لوگوں سے اسے ایسے ہی ملنا ہوتا ہوگا۔ دوپہر کے کھانے پر میری اس کی ملاقات پھر ہوئی مجبوری تھی ایک ہی میز ایک ہی کھانے کا کمرہ کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ دن بھر میں عصمت آپا کے پاس بیٹھی رہی جہاں ان کی بیٹھی وہ ایک کمرے میں تھیں چوکی نما پلنگ تھا یا نہ جانے کیا چیز تھی کبھی اس پر لیٹ جاتی تھیں یا بیٹھ جاتی تھیں جب غصے میں تقریر کرتیں تو گاؤ تکیہ پیچھے کر لیتیں میں نے انہیں اپنی نظم (land lady) سنائی جو غالباً ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۴ء میں لکھی تھی۔ وہ یاد نہیں۔ جب وہ لندن آئی تھیں اس وقت صرف دو صفحے پر لکھی ہوئی تھی اس وقت وہ رات کو دن میں صبح صبح چائے کے بعد مجھ سے فرمائش کر کے سنتی رہی تھیں۔ اس کے آخر میں تھا "اور چینی کے کیوبز ہلے اور چلے" ان میں طاقت ہے۔ بہت کئی دفعہ یہ حصہ پڑھوایا سوچتی رہی ایک رات کہنے لگی دیکھو سحاب چینی جو تم نے لکھی وہ Sex کا سمبل ہے "منٹو" کہا کرتا تھا۔ اس میں ایک پہلو ہے تمہارا۔ ہلے اور چلے یہ پہلو نکلتا ہے چینی کا بدل ہے۔

عصمت آپا مجھے نہیں معلوم میں نے حیرت کی کیفیت لکھی ہے۔ اپنے آپ کو اگر کوئی چیز جس سے آپ حیران ہو جائیں یا ایک دھچکا سا لگے تو ساری چیزیں ہلتی ہوئی کھسکتی ہوئی محسوس ہوں۔ اپنے چاروں طرف ویسی ہی کیفیت مجھے اس ٹرے میں نظر آئی اور میں نے لکھ دی۔ Sex وغیرہ کا کوئی تصور بھی نہیں اور نہ چینی کا سمبل مجھے معلوم تھا اس وقت۔

پھر کئی سال اسی طرح گذر گئے جب میں پاکستان آئی تو فرصت میں بیٹھ کر اپنی اور نظموں کے ساتھ land lady پر نظر ثانی کی۔ وہ نظم بڑھتے بڑھتے ۱۲ صفحے تک اور ادھر پھر میری عادت کہ لکھ کر چپکے سے رجسٹر میں سلا دیا۔ جب کبھی وقت آئے گا تو چھپوا دیں گے۔ کسی کو دکھانے کی عادت ہی نہیں۔ اس عرصے میں ایک دفعہ رسالہ شمع پڑھا تو عصمت آپا کا ایک افسانہ "واشنگ مشین" پر پڑھا اور انہوں نے معذرت کی "بیدی کی میلی چادر سے" میں حیران رہ گئی۔ عصمت آپا ۱۹۶۸ء سے ۱۹۶۴ء کے بعد میری نظم سننے کے بعد جو انہیں پسند آئی تھی۔ میرا خیال انہیں اچھا

لگا اور نئے موضوع نے اکسایا۔ اور افسانہ لکھ دیا مگر معذرت بیدی سے مانگی میں نے ساری تقریر ان کے سامنے کی اپنے اس غصے اور دکھ کو تو وہ بالکل بھول گئیں میں حیران رہ گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ کو وہ دن یاد نہیں۔ جب میں نے وہ نظم سنائی آپ نے کئی دفعہ سنی۔ نہیں بی بی! وہ سر ہلاتی رہیں۔

اس وقت وہ بیمار تھیں مجھے پتہ نہیں لگا۔ کسی نے ان کی بیٹی نے بھی نہیں بتایا کہ یہ بیمار ہیں۔ پدما نے بھی نہیں بتایا میں اپنی سمجھ کے برتے پر انہیں نظم سناتی رہی۔ لڑتی رہی۔ بحث کرتی رہی۔ نظم سننے کے بعد کہا اس میں خدا کی بندی کہیں بھی نہیں کہ وہ آوازوں سے Vespur کر رہے ہیں میں اور الجھ گئیں پھر سے وہ ٹکڑا سنایا۔ پھر آپ نے کیا خاک سنا عصمت آپا۔ چلو کھانا کھائیں اب تم نہیں جاؤ گی۔ اسی کمرے میں تم بھی لیٹ جانا خوب باتیں کریں گے رات بھر۔

نواسہ شاہد ایسے کئی زمانے دیکھ چکا تھا۔ چپکے سے کھانا کھا کر کتابوں بھری میز پر جھک گیا۔ خانساماں جوان کی ست رفتاری سے تنگ تھا جلدی جلدی برتن اٹھانے لگا۔

ٹھہرو ٹھہرو۔ بھئی یہ کیا حماقت ہے ہم ابھی کھا رہے ہیں۔ یہ کیا! وہ ویسے ہی گرجی اسکول کی انسپکٹر نہ جانے کہاں ان میں چھپی بیٹھی تھیں۔ او وہ ہال کے کمرے میں جیسے تقریر کر رہی ہوں اور خانساماں دال چاول کے ڈونگے وہیں رکھ گیا۔

اپنے اپنے ملک کے صاحب اقتدار ادیب اور شاعر جو برسوں سے اپنی اپنی جگہ پر مقیم ہیں وہ بالکل ہی ہجرت کو پسند نہیں کرتے۔ عصمت آپا سے کئی دفعہ میری بحث ہوتی رہتی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتیں۔ دلی والے شاہد بھائی کے ساقی اور لاہور کے نقوش کے بعد اب تک کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا جو باقاعدہ معیار کے قابل ہو۔ بہت سے رسالے پاکستان اور ہندوستان سے نکلے مگر سب بیکار۔ عصمت آپا میں کہتی ہوں کہ آپ لندن میں رہ جائیں آپ اور میں مل کر ایک رسالہ نکالیں گے۔ جس کی مدد حیدر آباد دکن سے جیلانی بانو اور مغنی اور بہت سے ادیب کریں گے۔ بمبئی سے سردار بھائی۔ کیفی اعظمی، سلمیٰ کرشن اور واجدہ تبسم۔ دلی سے عینی۔ مجتبےٰ۔ باقر اور حنفی سب مل کر کتابت کروا دیں گے پھر یہ رسالہ ہم ہندوستان اور پاکستان بھیج دیا کریں گے۔ پورے یورپ اور امریکہ، کنیڈا۔ پھر دیکھئے عصمت آپا کہ ان ادیبوں کی مدد سے کیا رسالہ نکلے گا۔ میں خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ یہ کام میں اکیلی نہیں کر سکتی جلدی جواب دیجئے۔ آپ میرے ساتھ کام کریں۔

ہاں۔ ہاں وہ ٹالتی رہیں اور آخر کار بحث کرتے کرتے ابل پڑیں اور میری اوقات کا data ہاتھ میں پکڑا دیا۔ تم بیوی جو پارٹ ٹائم پوسٹ آفس میں کام کرنے والی دوکانوں پر چیزیں Sale کرنے والی۔ انڈے ڈبل روٹی سے ایک وقت پیٹ بھر لینا۔ Corn flaks اور دودھ پی کر ایک وقت کی روٹی اڑا دینا Hand to mouth رہنے والے کیسے رسالہ نکالیں گے۔ اس کے لئے گجے چاہئے ہیں گجے۔ رسالہ اتنے پیسے کھاتا ہے چھ چھ مہینہ کا Material تمھارے پاس ہونا چاہئے۔ کاغذ ہونا چاہئے۔ کاغذ کی چھپائی کیا باتیں کرتی ہو۔ رسالہ نکالنا آسان ہے۔ نہیں بی بی مجھے کیا کالے کتے نے کاٹا ہے جو اچھی خاصی اپنی آمدنی چھوڑ کر اپنے ملک کے آرام و آسائش چھوڑ کر ٹکڑوں سے پیٹ بھروں۔ ایسا صاف جواب سن کر اس روز طبیعت صاف ہو گئی۔ ترقی پسند تحریک کے لوگ بھی ایسے بدل جاتے ہیں۔ آج کل کے ادیب اور شاعر سب باہوش ہو گئے سب کو اپنے آرام کا بہت خیال ہے۔ اپنے اقتدار کے لئے لڑتے ہیں۔ طبیعت کی سادگی انکساری سے بے خبر ہیں۔ عصمت آپا ہمیشہ بحث پر تیار رہتیں اور مخالفت کسی طور سے کرتی رہتیں۔

لندن کے ایک ہفتہ کے قیام میں وہ گھر پر رہیں۔ پاکستانی رسالے کتابیں جتنی بھی تھیں سب ختم کر ڈالیں۔ جب بھی میں نوکری سے واپس آتی وہ لیٹی پڑھتی ہوئی نظر آتیں B.B.C سے یاور عباس، آل حسن، یونس واسطی، راشد اشرف، سریندر کوچر سب کو گھر پر بلاتی رہیں کیونکہ باہر برف گر رہی تھی اور یہ چھوٹا سا کوٹ نما سوئٹر پہن کر آئی تھیں۔ آخر کار ایک دن الماری کھولی تو عقل نے مدد کی۔ "عصمت آپا میرے کوٹ پہن کر تو دیکھئے۔"

"لو بھلا ہم لوگ کتنے بیوقوف ہیں۔ یہ خیال تمھیں اور مجھے پہلے کیوں نہیں آیا"۔ پھر عصمت آپا نے میرے کوٹوں کو عزت بخشی۔ اور ہم دونوں ہنستے رہے اور لندن کی سڑکوں پر پھرتے رہے۔

ہنستے ہنستے عصمت آپا کی آنکھیں کتنی چمکیلی ہو جاتی تھیں۔ بچوں جیسی مسکراہٹ ننھے منھے دانتوں میں بکھری رہتی۔ چاہے ایک ایک دانت آرام سے گن لو۔ ابرو اور عینک کی کمانیاں ایک دوسرے پر واری ہوتی رہتیں۔ بلا کا ذہین چہرہ جس سے ہر انسان مرعوب ہو جاتا۔ ہاتھ پیر کسی جفاکش انسان کے جڑے ہوئے تھے۔ عورت کے ناتے سے ہاتھ پیروں کی ساخت نہ تلوے نہ ہتھیلیوں میں عورت پن چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ بس سارا رس مٹھاس آواز میں بھر لاتیں۔ سارا عورت پن آواز کے لوچ و خم میں نچوڑ دیتیں۔ لہجہ میں بلا کی مقناطیسی کشش چمک پیدا ہو جاتی جب

وہ کسی سے بحث میں تیار رہتیں۔ شکست کا پہلو جب جھلکتا نظر آتا تو ہوایں۔ اوں۔ سوچ کے لوچ میں لفظوں کو جمع کرنا شروع کر دیتیں۔ دوسرا فریق ان کے سہل پن سے ست رفتار خود میں ہو جاتا۔ پھر بھیا۔ بی بی میاں۔ بنو۔ جان سمجھوتوں کی طرف جھک جاتیں۔ یہ وہی عصمت آپا تھیں جو بمبئی کے ایک فلیٹ میں لمبا سا جھولا پہنے مرجھائی ہوئی سی عصمت آپا کیسی ڈری سہمی سی لگیں۔ میں خود اس کے غصہ کی تیزی سے ڈر گئی تھی۔ عصمت آپا پر بھی کوئی حکومت کر سکتا ہے یہ عصمت آپا اتنی بدل گئی ہیں میں نے سوچا دوپہر کو پچھلے زمانے اپنا بچپن کھانے کی میز پر سجاتی رہیں اپنے بچپن لڑکپن کی سیڑھیوں پر سے اترتی چڑھتی رہیں اماں ابا بھائیوں بہنوں اور بچھڑے زمانے کو کھانے کی میز پر اٹھا لائی تھیں۔ نواسا شاید ہر روز میں ایسے کئی زمانے دیکھ چکا تھا۔ چپکے سے کھانا کھا کر اسی کتابوں بھری میز پر جھک گیا جہاں سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھ کر آیا تھا۔

پھر نہ جانے کہاں سے عظیم بھائی ان کے قریب آگئے اور وہ ان کی بیماری سے پریشان سی لگنے لگیں گویا دوزخی کسی اور نے لکھا ہوگا۔ ان کے ننھیال اور ددھیال کے انجانے لوگوں سے گھبرا کر میں نے منٹو کا ذکر کر دیا۔۔ "کیا منٹو بھی یہیں اس فلیٹ کے پاس رہتے تھے"۔

نہیں بھئی یہ فلیٹ تو بہت بعد کی چیز ہے۔ اس محلہ میں کوئی جانتا بھی نہیں کہ اس محلہ میں کوئی مسلمان رہتا ہے۔ تمہارے کراچی سے آئے ہوئے بہت سے سندھی ہندو لکھ پتی خاندان رہتے ہیں۔ پھر نہ جانے کیسے روشن کا ذکر آگیا۔ تم کیسے روشن کو جانتی ہو۔ اس کی بیوی اِرا مو ترا میری بچپن کی سہیلی تھی میری پڑوسن تھی دلی میں اور روشن ناگر تھ آل انڈیا ریڈیو میں میوزیشین تھا، وائلن، سربہار اور جلترنگ بجاتا تھا۔ راکیش روشن اور راجیش روشن اس کے بیٹے ہیں اس کی بہو مجھے آپ کے گھر گاڑی میں چھوڑ کر گئی، ہاں مجھے معلوم ہے۔ تم اب شام کو مت جانا ٹرین میں سانتا کروز میں قتل کر دی جاؤگی تمہارے ٹکڑے ملیں گے اور میں دہل گئی۔ آج یہیں رہ جاؤ صبح چلی جانا۔ سیما کا میاں کائستھ تھا۔ یہ بچہ بڑا انٹیلجنٹ ہے۔ ہماری اکثر بڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ پھر ری بھی خوب کھیلتے ہیں ہم میں دوستی ہے میں نے پنڈت رکھ کر پوری گیتا بھی پڑھی۔ سحاب قرآن اور گیتا، بائبل، انجیل کے بہت سے کنارے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ پھر صبح اٹھتا ہے اور سارے ہی مذہب محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ ڈرانا، ڈرا کر سکھانا دوسری بات ہے۔ پھر وہ دال چاول کے ذائقے میں اماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی بڑیوں کا موازنہ کرتی رہی۔ کل ایک صاحب میرا انٹرویو لینے آرہے ہیں۔ تم بھی رہو۔ مزہ آئے گا۔ بس تم آج نہ جاؤ۔ رات کو باتیں

کریں گے۔ لندن میں کیسے اچھے دن گزارے ہمارے ساتھ۔ اکثر ہنسی آتی تھی یاد کرکے۔ منٹو بھی یاد ہے۔ عصمت آپا میری نظم "لینڈلیڈی" آپ پھر گول کرگئیں وہ مسکراتی رہیں عینک کے پیچھے سے۔ میں ان سے بہت بے تکلف ہوگئی تھی۔ اور وہ میرے ہر جائز ناجائز ریمارک پر ہنس دیتی تھیں۔ آپ تو سب کچھ بھول گئیں 'آئے ہٹو پیکیڈلی ہمیں سب یاد ہے۔ یاد ہے ذرا ذرا اور وہ ہنستی رہیں۔

عصمت آپا کو نئے نئے تجربے کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔ یہ مجھے چار پانچ دن میں ہی پتہ لگ گیا تھا۔ "آؤ بہن برائی کریں" ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ پھر کہانیاں در کہانیاں نکالنا۔ فلسفہ اور نفرت کے پہلو اجاگر کرنا۔ اسی راستہ سے دلوں میں چپکے سے گھس جاتیں۔ Observation کمال کا اللہ میاں نے بخشا تھا۔ گھونگر والے بالوں میں چھپا ہوا دماغ کیسے کیسے راستوں سے دلوں تک سراغ رسانی کرلیتا تھا۔ میرے چھپے ڈھکے زخموں کو اکثر بہت سے مرہم لگا کر آخر کار چپکے چپکے سارے ہی راز چمکیلی آنکھوں سے ایک ہفتہ میں اپنے اندر کھینچ لئے اور میں خالی خالی دو کوڑی کی ہو کر اپنے خزانہ کے خالی ہونے پر چپ چاپ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ میں ہرگز بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے سارے راز مجھ سے اگلوالیں بہت کوشش کی مگر سینکڑوں دروازوں سے وہ چپ چاپ چلی آتیں چمکارتی ہوئی۔ لڑتی ہوئی اور تجربوں کی پوٹلیاں کھولتی ہوئی اور میں اپنے آپ کو آخر کار ایک حقیر فقیرنی لگنے لگی۔ میری ساری دولت میرے راز میرے شکوے جو میں نے مخمل جیسی مسکراہٹ میں لپیٹ کر رکھے تھے وہ سب چھین لئے اور جواباً کہا کہ کس چیز پر اتراتی ہو تم۔ تم سے زیادہ اتنے ڈھیر سے میرے پاس دوسروں کے راز ہیں۔ دنیا بھری پڑی ہے تجربات سے۔ اے سحاب یہ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں تمہارے قصے کوئی نئے عجوبہ نہیں ان سے بہتر دکھ فلاں فلاں کے قصے ہیں۔ ویسے بی بی میں تو یہی کہوں گی کہ مرد بھٹکتے ہی اچھے لگتے ہیں میرے اور شاہد کے کئی دفعہ تعلقات خراب رہے مگر جب میں کمرے سے تیار ہو کر اسٹوڈیو جاتی اور مجھے گاڑی تک لینے اور چھوڑنے آئے لوگوں کے سامنے کئی دفعہ تو ان چھوکریوں کو چھوڑ کر تیزی سے میری طرف آتے کار کا دروازہ بند کرتے خدا حافظ کہتے۔ خدا کی قسم بہت مزہ آتا۔ میں چپ چاپ سب کی نگاہیں دیکھتی۔ خاموش منہ پھلائے ایسے بیٹھ کر گاڑی میں چلی جاتی۔ وہ چپ چاپ سے ٹہلا کرتے۔ سچ پوچھو تو مردوں پر مکھیاں بھنکتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ اور مکھیوں کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کی بیوی بھی ہے کیا سمجھیں بنو بیوی۔ حاضر جواب ایسی کہ مات کردیتی تھیں اپنے فقرے جملوں سے۔ یونس

واسطی کے گھر اس لئے لے گئی کہ بی بی سی کا Crowed ان سے مل لے گا۔ اور شام ان کی بھی اچھی گذرے گی۔ میرے گھر کے سامنے off - licnehel کی دکان پر گھنٹوں قیمتیں ہی پڑھ کر گذار آتی تھیں۔ بڑی خوش رہیں اس رات کہ ساری بوتلیں قیمتوں کے ساتھ ان کے سامنے میز پر تھیں رات وہیں رہنا پڑا۔ گیارہ بجے تک ہم تو بھوک سے مرگئے لیکن یہ لوگ کھانا ہی نہیں کھا رہے تھے۔ ساقی فاروقی کو مفت کی ملے تو شام اور رات کا فرق ان کو غنڈی ہی سمجھا سکتی تھی۔ میں تو بھابھی کے کمرے میں کھانا کھا کر سو گئی۔ یہ لوگ بحثیں کرتے رہے شور مچاتے رہے۔ تین چار بجے یہ بھی بھابھی کے کمرے میں سونے آئیں اور مجھے جھنجوڑتی رہیں اٹھو سحاب، بہت سو لیں ہم تم کو ایک ضروری بات کہنے کے لئے جگا رہے ہیں۔ ہم تو صبح دیر سے اٹھیں گے۔ لبے شاہ جب گھر جائیں تو میری طرف سے ایک پیغام دیدینا کہ واسطی نے جو پانچ پاؤنڈ کا B.B.C سے پرانا لمبا چوڑا فرج خریدا تھا جو Passage سے آگے نہیں جا سکتا وہیں پھنس گیا ہے شاہ صاحب سے کہنا کہ وہ دکھیا اپنی مٹھی میں بند کر کے لے جائیں۔ ہم سب پر بڑا کرم ہو گا۔ بڑی مشکل سے سیڑھی چڑھ کر آتی ہوں۔ راستہ صاف ہو زندگی عذاب ہے مسز واسطی کی۔ ضرور یاد کر کے کہہ دینا پھر وہ دوسرے پلنگ پر لحاف اوڑھ کر چپ چاپ سو گئیں۔

بڑے سے بڑا لطیفہ کہہ جاتیں پھر تھوڑا سا مسکراتیں۔ ایک دفعہ مجھے یاد نہیں پارٹیشن کے بعد سپرو ہال میں۔ میں شاہد دہلوی اور عصمت آپا نہ جانے کیسے ایک ساتھ دلی میں اس ہال میں ساتھ بیٹھے تھے شاید Peace کانفرنس تھی۔ پنڈت نہرو تقریر کر رہے تھے ایسی خوبصورت تقریر ایسے میٹھے میٹھے لفظ۔ میں پہلی دفعہ پنڈت جی کی تقریر سن رہی تھی۔ پنڈت جی کہہ رہے تھے کہ ہمارا ایک کلچر ہے ہم سب ایک ہیں ایک بات چیت کا طریقہ ہے رہن سہن ایک ہے سب کچھ ایک ہے لوگوں کے بھرے لمبے چوڑے ہال میں ایسی خاموشی تھی کہ عصمت آپا نے سرگوشی میں سر جھکا کر کہا "بالکل غلط صبح ہی صبح غسل خانے جاؤ تو کلچر مختلف ہوتا ہے ہمارے لوٹے کی ٹونٹی ہوتی ہے اور ان کا لوٹا بغیر ٹونٹی کے ہوتا ہے۔ میں اور شاہد بھائی ہنسی دباتے دباتے پاگل ہو گئے اور یہ چپ چاپ سے مسکراتی رہیں۔ اس روز لندن میں Maida vale پر بس سے اتر گئیں بغیر کہے۔ نہ راستے معلوم نہ گھر کا پتہ ان کے پاس میں بھی جلدی سے گھنٹی بجا کر دوسرے اسٹاپ اتری۔ پریشان کہ نہ جانے کہاں چلی جائیں گی کہاں ڈھونڈوں۔ چلتے چلتے ایک بینچ پر بیٹھ گئی بہت تھک گئی تھی۔ سوچتی رہی ان کو منن کا پتہ تو معلوم ہو گا منن ان کا بھتیجہ یا بھانجا تھا تو اطمینان ہوا کہ چلو کھو

نہیں سکتیں۔

Madia vale کنڈکٹر کی آواز پر نیچے اتر گئیں میں دیکھتی رہ گئی تھوڑی دور پر way best ایک پاکستان کی دوکان سے سوچا کہ سموسے خرید لوں بھوک لگ رہی تھی عجب الجھن میں تھی نہ جانے کہاں گئی ہوں گی۔ ان کی جغرافیائی حالت بالکل معلوم نہیں تھی۔ دونوں ٹکٹ میرے پاس تھے۔ نہ جانے پیسے ان کے پاس تھے۔ بٹوے قسم کی کسی چیز کا علم نہیں تھا۔ تھوڑی امید تھی کہ شاید اندر نہ ہوں دیکھا کاؤنٹر پر کھڑی تقریر کر رہی تھیں۔ یہ آج کل عربوں کا محلہ ہے دوکاندار کو کیا معلوم کہ یہ عصمت چغتائی ہمارے ہاں کی مشہور رائٹر ہیں۔ وہ ہاں ناں کرتا رہا۔

بھئی یہاں انگریزوں کے ادیب اور شاعر رہتے تھے۔ یہ بڑا Aristocrat علاقہ تھا۔ سارے ادیب یہیں رہتے تھے اور تمہیں کچھ نہیں معلوم اور میں نے جی ہاں کہا اور ان کو زور سے پکڑا۔ یہ جہلم سے سیدھا یہاں آیا اور Till پر بٹھا دیا گیا اس کو انگریزی روپے گننے آتے ہیں اور یہ آج کل عربوں کا علاقہ ہے۔ تازے گوشت کی جگہ یہ عربی میں نام لکھے ہیں۔ اھلاً سہلاً ہر جگہ لکھا ہوا ہے۔ اب یہاں امیر کروڑپتی عرب رہتے ہیں اور ہمارے ہیم جی بھی رہتے ہیں "برگر نہیں یہ نیلے نیلے گول گول بورڈ لکھے ہوئے ہیں یہ سب ادیبوں کے نام ہیں۔"

"عصمت آپا آپ ٹھیک کہتی ہیں آپ Hamested چلئے۔ ایسے ہی گھروں پر نام لکھے ہیں۔

Milton - D. H. Lawrence Keats - Byron Carl Marx constable-

اور سب اور تو اور ٹیگور کا گھر بھی جہاں وہ رہتے تھے پھر وہ میرے ساتھ آکر بینچ پر بجھی بجھی سے بیٹھ گئیں سموسوں سے بھوک اور چمکی تو میں اور وہ سردی سے بچنے کے لئے Maedonald میں گھس گئے اب میری باری تھی۔ عصمت آپا آپ نے تو مجھے تباہ کر دیا۔ آپ کے پاس نہ پیسے نہ ٹکٹ نہ میرا پتہ۔ آخر رات آپ کہاں جاتیں اور وہ بے تحاشا ہنستی رہیں۔ adventure adventure سحاب بی بی نہ آسماں کی خبر ہے نہ زمین کی خبر۔" وہ مصرع تو ٹھیک پڑھ گئی، سامنے کی میز پر ایک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے پر واری و قربان ہو رہے تھے یار یہ امریکن بھی خوب قوم ہے۔ وہ نئی قوم کے لڑکے لڑکیوں کی محبت اور پیار پر جلتی رہیں۔ ہم اپنے بچوں کو کتنی قید میں رکھتے ہیں جلدی میں جو بھی ملا وہی اچھا لگا اور یہاں ہے خوب سے

خوب ترلے۔ بات ہوئی نہ ان کو جینا آتا ہے یہ امریکن بھی خوب قوم ہے۔

پھر طے ہوا کہ آج ایسے ہی گھومیں گے۔ چلو بڑے بڑے اسٹور یہاں سے شروع ہوتے ہیں چلتا ہے " "نہیں پکاڈلی چلتے ہیں پھر سوہو دیکھیں گے شام کو B.B.C کینٹین چلیں گے وہ تو شکر ہوا کہ سارا دن کا ٹکٹ لے لیا تھا ان کو بالکل خیال نہیں ہوتا تھا کہ کتنے کا ٹکٹ ہوگا جیسے ہندوستان میں چل رہے ہیں۔ یہاں ایک اسٹاپ پر ایک پاؤنڈ خرچ ہو جاتا ہے میں خاموشی سے چلتی رہی اور سوچتی رہی کہ میری ہی قسمت میں پیسے گن گن کر دن گذارنے اللہ میاں نے لکھے ہیں اپنے ملک سے جو بھی آتا ہے وہ یہ سب نہیں سوچ سکتا۔ خاطرمدارات کے یہ بھی مختلف پہلو ہیں بقول کسے ہمارے تو منٹ گھنٹے پیسوں سے گن گن کر گذرتے ہیں۔

ٹھنڈے اداس اندھیرے سوہو کی گلیوں میں ہم دونوں خاموش تھے میں تھکن سے چور ننگی عورتوں کے اشتہاروں سے لاپرواہ روزمرہ کی دیکھی بھالی چیزیں جس میں کوئی زندگی نہیں بلاوے ہی بلاوے۔ اندر آؤ۔ ہم کو دیکھو ہمارے جسم ایسے ہیں۔ کتنے روپوں میں کتنے وقت میں ایک ٹکٹ پر آؤ دیکھو اور چلے آؤ۔ کچھ اور بڑھا چڑھا کر وقت کے پیسے دیدو۔ وقت خریدو اور تجربہ بھی خریدو۔ نئے نئے ملکوں کے جسموں کا اور ڈھیر ساری کہانیاں لے جاؤ اور یہ میری کہانی لکھ مسکراتی ہوئی مجھ سے پیسے لیکر سوراخوں سے تجربوں کو خریدتی ہوئی اس معصوم سی چھپی ہوئی لڑکی کو آخر کار لے آئیں جو انسپکٹر آف اسکول کے قبضہ سے نکل کر سہمی سہمائی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ لڑکی جس نے کمرے کی روشنی سے لحاف میں ہاتھی دیکھا تھا یہ وہی لڑکی تھی جو آج زندگی کے زندہ تماشے دیکھ کر آ رہی تھی۔ میری عصمت چغتائی جس نے ادبی دنیا میں "لیسنربین" پن کا تعارف کروایا تھا۔ عورت کے مرد سے روٹھنے کا بدلہ۔ رات کی روشنیوں نے سڑکوں اور گلیوں میں زندگی پیدا کر دی لوگوں کی آمدورفت تیز روشنیوں کے قمقموں میں جگمگ کر رہی تھی عصمت آپا خاموش تھیں "عصمت آپا لوگ آنے شروع ہو گئے ہیں اور غور سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"اے لو یہ بھی خوب رہی ہم نہ دیکھیں۔ وہ جو یہاں کرنے آئے ہیں ضرور جائیں گے ہم بھی۔ یہ کون ہوتے ہیں ہماری جنس کو نچوا رہے ہیں جیسا جی چاہے۔" پیسے ختم ہو رہے ہیں میں نے ہلکے سے کہا گھر چلئے شام کو میں اور آپ اکیلے ٹھیک نہیں کوئی مرد ہوتا تو ہمیں سیاح سمجھتے۔

گلی کے نکڑ پر ایک بوڑھا سفید بالوں پر کالی لمبی ٹوپی اوڑھے ٹیپ ڈانس کر رہا تھا۔ ایک نوجوان

لڑکا اپنی ٹوپی الٹی کئے پیسے اکٹھے کر رہا تھا۔ گٹار بجانے والا ان دونوں سے علیحدہ اپنی دھن میں آنکھیں بند کئے گٹار بجا رہا تھا۔ عصمت آپا اچک کر ایک منڈیر پر بیٹھ گئیں۔ اشتیاق بھری نظروں سے منظر دیکھتی رہیں China Town روشنیوں میں ڈوبا ہوا سوہو کا علاقہ ہے جہاں چار بجے سے رات ہو جاتی ہے۔ اور عصمت آپا اٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔ لوگ یہیں دیکھ رہے تھے نہ جسم اچھے نہ عورتوں میں شامل تھے۔ میں نے ان کے چہرے پڑھ کر عصمت آپا کو بتایا تو خوب ہنسیں۔
"ہٹو اب اتنے برے بھی نہیں ہیں ہم۔ یہ بیچارے ہمدردی سے ہمیں دیکھ رہے ہیں یہ سب تمہارے اول جلول خیالات ہیں۔ چلو اس لڑکے سے کہتے ہیں کہ ہم سے بھائی پیسے لے لو اور ہمارے ساتھ چلو اور میں اپنی ہنسی نہ روک سکی "وہ کہے گا" ہنسی سے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ "وہ کہے گا کہ مائی میرے پیسے بھی لے جا اور اس بڈھے سے جان بچادے اور تو اس بڈھے کو بھی لے جا۔ میری جان چھوڑ۔ بڑی نالائق ہو بیہودہ۔ الن اور وہ منڈیر پر سے دھم سے کودیں۔ اتنے برے بھی نہیں ہیں سحاب بہت بری ہو تم۔"
"اللہ میاں کی خوبی ہے ورنہ ہر عورت پھڑک کر مر جاتی آج۔ ہر عورت اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہے۔ یہ ہی تو اللہ میاں کا کمال ہے۔"
اسی رات ہم دونوں تھکے تھکے اپنے گھر گرم دودھ کی کافی پی رہے تھے اور وہ رات بھر سوہو کے سوراخوں کی کہانیوں سے پریشان رہیں۔ عورت کو کتنا ذلیل کرتے ہیں یہ لوگ۔ مرد واقعی جانور ہوتا ہے۔ یہ کیا نظام ہے اور ہر ملک میں پنپ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ہوتا تو جلا کر خاک کر دیتے محلے کے محلے۔ ہم سب چھپا کر یہ سب کرتے تو ہوں گے۔ ہمیں چھپا کے کرنے کی عادت ہے۔"
"نہیں بھئی ہم لوگ پھر بھی شریف ہیں"۔ کیوں سحاب بھئی تمہارے دیدے کا تو پانی ڈھل گیا۔ اب دیکھو نہ دیدے کا پانی ڈھل جانا۔ پھر ہنستی رہیں۔ ان کے چہرے پر دو دفعہ معصومیت دیکھی یہ عصمت نہیں سہمی ہوئی سی بچی لگیں۔ وہ تنہائی کے شہر میں اترتی گئیں چپ چاپ کافی پیتی رہیں۔ گھونگر والے بالوں کے اندر ان کا دماغ نہ جانے کیسے کیسے پچھتاوے سلجھاتا رہا۔ بہت رات تک ان کے کمرے میں بتی جلتی رہی۔
صبح صبح کام پر جانے سے پہلے ان کا ناشتہ بنا کر رکھ گئی۔ چپکے سے نکل گئی تاکہ میں ان کو نہ دیکھ سکوں۔ ایک شرمیلی اداس لڑکی نہیں مجھے تو عصمت آپا سے محبت ہے۔ مجھے یہ رخ اچھا نہیں لگا بہادر عورت۔ عورت کی طرف دار عورت۔ عورت کے لئے لڑنے والی اور پھر وہ عورت جو مجھے

آخری ملاقات میں نظر آئی بمبئی میں وہ عصمت آپا کھو گئیں تھیں۔ سیما کے ساتھ کا منظر۔ سیما نے عصمت آپا کو مغلوب کر لیا تھا۔ عصمت آپا پر بھی کوئی حکومت کر سکتا ہے میں حیران کھڑی تھی جیسے میں عصمت آپا سے ملنے نہیں آئی غلطی سے ان کے گھر آ گئی ہوں۔ اور اب چند منٹوں میں نکالی جاؤں گی کہاں وہ رات بھر کے لئے ٹھیر جانے کو کہہ رہی تھیں۔ "عصمت آپا آپ مجھے ٹیکسی منگوا دیں۔" نوکر کو نیچے میرے ساتھ بھیج دیں یہ ٹیکسی کا نمبر لے آئے۔ یہ پاکستان نہیں ہے یہاں ہر طرف اطمینان ہے ٹیکسی ہر وقت ملتی ہے وہ روانی سے انگریزی میں کہہ رہی تھی۔ یہ ان کی بڑی لڑکی تھی جس نے آتے ہی ٹیلیوژن زور سے بند کر دیا تھا جس کے پیچھے تین موٹے پیٹ والے لالے تھے جو بر آمدے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ جن کو دیکھتے ہی خانساماں ایک دم بیرا بن گیا۔ ٹرے میں گلاس جھاگ اڑا رہے تھے۔۔نہ۔

ارے بھئی تم آ گئیں اور ٹیلیویژن کیوں بند کر دیا۔ عصمت آپا نرمی سے مسکرائیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ کیسی بد تمیز بچی تھی میں نے سوچا۔ Waste of eletricity۔ نہیں بھئی ہم دیکھ رہے تھے۔۔ وہ دونوں ہوا میں باتیں کر رہی تھیں ابھی نہیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے میں بولے جا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ سارے کمروں میں وہ انسپکشن کرتی پھر رہی تھی ڈرنک لاؤ' برف لاؤ وہ برابر آرڈر دے رہی تھی سارے گھر میں حرکت ہو رہی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ عصمت آپا جلدی سے باورچی خانہ سے دو گلاس اٹھا لائیں ان کا سانس پھول رہا تھا۔ اتنی تیزی سے لائی تھیں۔ اک میرے سامنے رکھ دیا ایک اپنے سامنے۔ بڑی پیار بھری نظروں سے گلاس کے جھاگ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے عصمت آپا سے کہا مجھے نہیں چاہئے۔ "ارے ہٹاؤ۔ چپکے سے پی لو"۔ وہ ایسے ہی کام سے جھنجلاتی ہوئی آتی ہے ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ تم پیو بیر ہے بیر۔ میں نے تو کبھی نہیں پی۔ آج کیسے پی لوں میں نے بھی ڈر کر سرگوشی سے کہا' نہ جانے کب آ کر میرے منہ پر ماریں۔ میں پرس لے کر کھڑی ہو گئی۔ عصمت آپا نے لپک کر میرا گلاس جلدی جلدی غٹ غٹ پی لیا "آئے ہٹو تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا" میں نے مناسب نہ سمجھا کہ کیا انھیں سمجھاؤں۔ اور خانساماں کو لے کر نیچے آ گئی۔

یہ تھی میری اور ان کی آخری ملاقات۔ نیچے آ کر میں نے ٹیکسی بڑے اعتماد سے لی اور ڈرائیور کے سامنے نوکر سے کہا۔ جو ہو لے چلو۔ گھر جاتے ہی فون کروں گی۔ دوا جلدی سے بھیج دوں گی۔ بی بی کے لئے تم جاؤ اب خانساماں حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا بھگوان کے

لئے جلدی لے چلو مجھے دوا بھیجنی ہے ماں بہت بیمار ہے اور اعتماد سے پیچھے بیٹھ گئی جیسے میں اسی شہر کی رہنے والی تھی اور راستے بھر سوچتی رہی کہ پدما نے ٹھیک کہا تھا کہ آپا شام کو نہ رہنا۔ یہ شاہد بھائی اور عصمت آپا کی بدتمیز لڑکی۔ جس نے میری بہادر عصمت آپا کو لاچار بنا دیا اور ہراساں کرتی رہتی ہے۔ ”ان نینن کے یہ ہیں لیکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ۔“ عصمت آپا کسی سے کم نہ تھیں۔ راشد صاحب کی طرح وہ بھی جلادی گئیں کسی نے ان کی لکھی ہوئی تحریر نہ دیکھی ن۔ م۔ راشد اور عصمت آپا یہ دونوں ہی باتوں باتوں میں جلادئے گئے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ قوم کا ادب اثاثہ ہے ہمارا بھی حق ہے ان کی بیٹی اور ان کے بیٹے' بیوی سے کوئی لکھی ہوئی تحریر تو دیکھتا۔ کیا اندھیر ہے لوگ باتیں کرتے ہوئے یاد نہیں رکھتے کہ محض تفریحاً کہا گیا ہے فیشن کے لئے ایک خیال آراستہ کیا ہے ایک نئی چیز کو دکھاسنا ہے اپنانے کو تو نہیں کہا۔ اور بیٹے بیٹی بیوی نے وصیت کے بغیر اور کھڑے کھڑے جلادیا جو اندر سے سہمی ہوئی مسلمان لڑکی تھی اپنے گھر کے پورے خاندان میں سانس لیتی رہتی تھی ساری عمر بوڑھاپے میں محبت چاہت ڈھونڈتی رہی محبت کی پیاسی کو جلدی سے دنیا سے نفرت کروادی۔ اور جلوادی گئی۔ یہ تھیں میری عصمت آپا مظلوم پیاری محبت سے بھرپور۔ جس نے بھائی کو دوزخی لکھا اور گلے لگائے رہیں۔ مرنے کے ساتھ بڑھاپے میں ایک ایک قدم ان کے چومتی رہیں۔ ادھر ن۔ م۔ راشد صاحب اپنے لوگوں میں بیٹھنے کے لئے ترستے تھے سارے خاندان پر جان دیتے تھے مگر کافی اور شراب پیتے تھے سب دکھاوا۔ ساقی کہتے ہیں انہوں نے جلوانے میں کوئی مدد نہیں کی۔ پھر ادیبوں کی ایک تنظیم بنا کر جلوانے کی جگہ کیوں ان کی بیوی کا ساتھ دیا۔ بیٹا لندن آیا اور جلانے کی جگہ نہیں گیا۔ اب ساقی کو ہوش آیا تو اپنی قبر کیوں بک کروالی۔ تاکہ ان کی بیوی ان کو جلوا نہ دے۔ کیوں کہ سائنس کا یہ طریقہ بڑا اچھا ہے۔ موڈرن بنے ہوئے یہ لوگ اندر سے وہیں کھڑے رہتے جہاں سے چلے تھے۔ سیما کے شوہر کا ستم تھے بیٹا بھی ادھر ہی جائے گا عصمت آپا کا کیا قصور تھا بڑبولی تھیں۔ اندر سے وہ مسلمان تھیں جیسے کہہ رہی ہوں سحاب سارے مذہب پڑھو تو سب کے کنارے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ چلو ہٹاؤ اگر جلا دیا تو جلا دیا۔ اب مٹی میں کیڑے کھائیں یا پانی میں مچھلیاں کھائیں۔ جیسے چپکے چپکے وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ اور مجھے قرار آگیا۔ عصمت آپا سنئے تو۔۔۔۔۔

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہم رام لیلا' آلا اودل' ہر رات سنا کرتے تھے۔ محلے میں ساون کی اندھیری راتوں میں بہت سی عورتیں مل کر گایا کرتی تھیں۔ اور ہم رام سیتا کا بن باس سوچتے سوچتے سو جاتے تھے۔ جس زمانے میں راجہ دسرتھ کی کھڑاویں رکھ دی جاتی تھیں اور حکومتیں چلتی رہتی تھیں۔ خون تو خون کبھی کسی قتل کی خبر بھی ارزاں نہیں تھی۔ صبح ہی صبح جمنا کی سیر کو جب عورتیں جاتی تھیں تو درختوں کی جڑوں میں آٹا اور چینی پھینکتی جاتی تھیں کہ چیونٹیاں بے زبان ہیں' خود کھانے کو نہیں مانگتیں۔

اور آج ۱۹۸۲ء میں اس بھری دوپہر میں کلفٹن کے علاقے میں خوبصورت اٹیلین طرز کے ننھے منھے فلیٹ کے باہر بوگن ولا سے ڈھکے دروازے پر جب میں نے گھنٹی بجائی تو سوجی سوجی آنکھوں والی ہاجرہ نے دروازہ کھولا۔ نہ جانے کیا وحشت نے ستایا کہ جو ہاجرہ کے پاس آ گئی۔ میرا فلیٹ ہاجرہ کے گھر کے پاس ہی تو ہے۔ ارے تو یہ بھی اداس بیٹھی تھی۔۔ یہ ہوتی ہے دل سے دل کو راہ۔۔۔

کوریڈور میں ایک کرسی جس پر اپاہج مریض بٹھا کر لے جایا جاتا ہے' ایک کونے میں رکھی تھی' میرے دل کی دھڑکن بڑھا رہی تھی۔۔ یہ کیا ہوا۔ یہ کرسی ہاجرہ' کس کے لئے آئی۔ آج صبح چار بجے خدیجہ لندن علاج کے لئے چلی گئی۔۔ یہ ان کے لئے آئی تھی۔ سحاب میں بڑی بے چین ہوں رات بھر نہیں سوئی۔ خدیجہ بہت ہی کمزور ہو گئی ہے۔ اور پھر جیسے ہاجرہ کو قرار آ گیا۔ سوجی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ چہرہ آنسوؤں سے دھلتا رہا۔ گویا طوفان میرا انتظار کر رہا تھا۔

آج شام ٹیلیفون سے پتہ لگے گا۔ وہ چائے بنانے باورچی خانے چلی گئی۔ اور میں جدید طرز کے ہاجرہ کے بیڈ روم میں بیٹھی سوچتی رہی۔ یہ دونوں وہی جھوائی ٹولے کی سیدھی سادی شریف سی لڑکیاں ہی تو ہیں، جن کی شکلیں دیکھنے کے لئے میں نے لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشن کا مشاعرہ قبول کر لیا تھا۔ ہاجرہ اور خدیجہ مستور کو دیکھوں گی۔ آنے جانے کا کرایہ ریڈیو دے رہا ہے۔ میں ان سے ملنے کے لئے کس بے چینی سے لکھنؤ پہنچی۔ مشاعرے کے بعد ریڈیو کی کار میں ان کے گھر جھوائی ٹولے پہنچی تھی۔

شاید ۴۴۔۱۹۴۳ء کے زمانے کی بات ہے رسالہ "ساقی" ہم کو پڑھنے کے لئے نہیں دیا جاتا۔ عصمت، جوہر نسواں، بنات، پھول ہماری میز پر رکھ دیئے جاتے تھے۔ ہمارے لئے دوپہر میں، رات میں اور صبح صبح ایک ہی گوشہ تنہائی تھا۔ جہاں ہم ساقی، ہمایوں، شاہکار وغیرہ قسم کے رسالے پاجامے میں اڑس کر بیت الخلاء لے جاتے اور جلدی جلدی پڑھ لیتے۔ عصمت اور منٹو کو بھی اس زمانے میں چپکے چپکے پڑھتے۔ بھائیوں سے کجابحث و مباحثہ ہوتا اسکول کی ساتھیوں میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جس سے کچھ بات ہوتی ادب پر۔ کئی دفعہ منٹو، عصمت پڑھتے مگر گتھیاں سلجھنے نہ پاتیں کہ بھلا یہ کیا افسانے کا اختتام تھا۔ ان افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ کرشن چندر اور شفیق الرحمان تھے جو دل میں ہلچل مچانے کے لئے کافی تھے۔ شفیق الرحمان نے اپنی تصویریں چھپوا کر ہر لڑکی کو "شبو" بنوا دیا تھا۔ ان ناموں کے ساتھ ساتھ دو نام اور آنے شروع ہوئے۔ خدیجہ اور ہاجرہ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی سے "آجکل" رسالہ نکلا اور خدیجہ اور ہاجرہ برابر اس میں چھپنے لگیں۔ ہفتے اتوار کی چھٹی میں میں "تمار پور" ضرور جاتی۔ میرے رشتے کے ایک چچا آغا محمد یعقوب رہتے تھے۔ وہ "آجکل" کے ایڈیٹر تھے۔ ہمارے گھر سے بھی ایک رسالہ "چمنستان" نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر میرے منجھلے بھائی آغا سرخوش تھے۔ اور میں گھر کی سب سے چھوٹی اولاد تھی جو بے وقوف تھی جاہل تھی۔ گیارہ سال کی لڑکی جو اسکول سے آتی اور کھیل کود میں لگ جاتی۔ زندگی بھر کسی نے سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ گھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ پچھلے دنوں عصمت آپا اپنے "لحاف" کے مقدمے کے سلسلے میں دلی آئی تھیں، ہمارے گھر بھی کھانے پر آئیں تو اکیلے میں کتنی باتیں میں نے ان سے کر ڈالی تھیں۔ منٹو اور ان کے لکھے ہوئے ادب پر "قرۃ العین، خدیجہ، ہاجرہ کی حیثیت ان کی نظر میں" اس وقت میرے گھر کی حیثیت لئے ہوئے تھے۔ "وہ بچیاں ہیں اور تم بھی تو بچی ہو بی بی۔" "مگر تم اس ماحول میں سرخوش کی بہن ہوتے ہوئے ریڈیو بھی جاتی ہو

اور اسکول کی آٹھویں جماعت کی طالبہ بھی ہو"۔ میری اس بے وقوفی کے سوال پر کہ خدیجہ اور ہاجرہ کو آپ نے دیکھا ہے انہوں نے کہا: "نہیں بی بی سنا ہے لکھنؤ میں رہتی ہیں پردہ دار ہیں۔ تصویریں وہ کہاں چھپوائیں گی"۔ اور خدیجہ اور ہاجرہ سے ملنے کی تمنا اور بڑھتی گئی۔ میرے ساتھ سارے پڑھنے والے ایڈیٹران اور ریڈیو کے صاحبان ان بہنوں کی صورت دیکھنے کے لئے تڑپتے۔ کئی دفعہ ریڈیو پر لوگوں نے یہ بھی کہا ارے بھئی نام بدل لئے ہیں۔ پردے میں 'مرد کا قلم ہے۔ اور لکھنؤ ریڈیو کے اس مشاعرے میں جانے کے لئے میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ریڈیو کے ڈائریکٹر فرید صاحب سے گاڑی لے کر جب جھوائی ٹولا خدیجہ 'ہاجرہ کے گھر پہنچی 'کار تو باہر گلی میں رک گئی اندر جا ہی نہیں سکتی تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے جتنی اطلاعات میں نے ریڈیو اسٹیشن سے ان بہنوں کے لئے جمع کی تھی وہ تو میں واپسی پر ان کے چھوٹے سے زینے کی اونچی اونچی سیڑھیوں پر گرا آئی جن پر چڑھنا چھوٹی ٹانگوں والوں کے لئے بڑا مشکل تھا۔۔۔

سفید لٹھے کے پردوں میں گھرا ہوا چکوں سے ڈھکا ہوا کمرہ یاد ہے۔ لمبی سی مانگ لئے چنے ہوئے دوپٹوں میں دبلی پتلی چمکدار آنکھوں والی سانولی سلونی لڑکیاں جن کے چکنے سیاہ بال تیل سے چمک رہے تھے۔ خدیجہ اپنا چہرہ بڑی بڑی آنکھوں سے ڈھکے ہوئے تھی۔ ان دونوں بہنوں میں سے نہ جانے کس نے مجھے ایک پائلٹ کی تصویر دکھائی ایسا پائلٹ جو حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں ہوتا تھا۔ یہ دیکھو سحاب قرۃ العین کے افسانوں کا ہیرو ہم نے کاٹ کر رکھا ہوا ہے۔ اور میں سوچتی رہ گئی کہ میں عینی کو اتنا پڑھنے اور ملنے کے بعد 'کبھی کسی ہیرو کو عینی کے ساتھ نہ ملا سکی۔ وہ بھی ہم جیسی ایک کھلنڈری لڑکی ہے جو قلم سے گھروندے بناتی رہتی ہے۔ اور جب قلم میز پر رکھ آتی ہے تو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں رکھی ہوئی گڑیوں سے بھی ضرور کھیلتی ہوگی۔ میں نے عینی کو ہمیشہ ہی سب کے ساتھ مل کر باتیں کرتے پایا۔ میں نے عینی کے لئے کبھی ایسے نہ سوچا۔ اپنی اپنی سوچ۔۔۔۔۔

خدیجہ ہاجرہ ویسے تو پانچ بہنیں ہیں۔ ان کی بڑی بہن عائشہ کا نام بھی نظروں سے گزرا ہو گا بلکہ پہلے ان کا نام کئی افسانوں کے ساتھ آیا۔ جی ایم درانی کی آواز کس کو یاد نہیں۔ سریلے تھے۔ اچھے گانے والوں میں سے تھے۔ مگر دنیائے ادب میں پھپھوندوی 'خاندان کی دو بہنوں کے نام ترقی پسند ادب کی تحریک کے زمانے سے آج تک چلے آرہے ہیں۔ تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔ لاہور کی ایک سرد شام میں فیض صاحب سے ملنے گئی تو کالے کوٹ میں۔ کٹے ہوئے بالوں سے گھرا

ہوا ننھا سا چہرہ فیض صاحب کے بازوؤں کے قریب سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔ ارے بھئی سحاب ان سے ملو۔ یہ ہیں خدیجہ۔ اور میں سکتے میں رہ گئی۔۔ یہ ماڈرن سی خاتون' یہ وہ خدیجہ ہیں جن سے ملنے کے لئے میں کس چاؤ سے لکھنؤ گئی تھی۔ خدیجہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ پھر پتہ لگا دونوں کی شادی ہو گئی ہے ندیم بھائی کے بھانجوں بھتیجوں سے۔ ہاجرہ خدیجہ سے ایک سال بڑی تھی۔ ایک ماحول میں دونوں نے پرورش پائی۔ ایک ساتھ لکھنا شروع کیا۔ شادی بھی ایک ہی دن ہوئی۔ دونوں کے شوہر صحافی۔ دونوں کے دو دو بچے ہیں۔ دونوں کے افسانوں کے چار چار مجموعے ہیں۔ ہاجرہ نے اپنے ڈراموں کے مجموعہ "وہ لوگ" شائع کیا تو خدیجہ نے بھی "آنگن" ناول لکھ کر اپنی تصانیف کی تعداد پانچ کر لی۔ دونوں کے نظریات بس کہیں ملتے جلتے ہیں مگر دونوں کی شخصیت میں گنگا جمنی فرق ہے۔

خدیجہ کہتی ہے میری کہانیوں میں رومان بھی ہوتا ہے لیکن اس طرح کہ نہ تو محبت اندھی ہوتی ہے اور نہ محبت کی خاطر کوئی تباہ و برباد ہو کر جان سے ہاتھ دھوتا ہے۔

ایک بڑی وجہ تو یہی ہے کہ مرد کا معاشرے میں بلند درجہ اور عورت کے مقابلے میں حد سے بڑھا ہوا احساس برتری۔ جب احساس برتری حد سے بڑھ جائے تو کچھ اچھے نتائج کا حامل نہیں ہوتا۔ عورت کو مختلف مدارج سے گزارا۔ کبھی تو لونڈی بنا کر بازاروں میں بیچا گیا۔ اسے حسین مان کر معبدوں میں قربان کیا گیا۔ اور کبھی اسے کوٹھوں پر سجا کر برائی کا سمبل بنایا گیا۔ ادوار بدلے زیادہ مہذب بنے تو عورت کو اشتہاروں میں جڑ دیا۔ عورت وہی بکاؤ مال۔ اور جب عورت اپنا صحیح مصرف سمجھ کر مرد کے دوش بدوش کام کرنے باہر نکلی تو کالی بلی کی طرح اس کا راستہ کاٹ دیا گیا۔ مگر اس کے باوجود عورت اور مرد کے محبت کے رشتے کو نفرت سے نہیں بدلا جا سکا۔ آخر اس وجہ کو یوں نہیں مارا جاتا۔ جس کی بنا پر چوریاں ہوتی ہیں۔ نرم و نازک برگ گل خدیجہ پنجاب کی بھوبی خواب دیکھتی رہی۔ اپنی بچی کا نام بھی اس نے کرن رکھا۔ اس نے نئی نسل کے نام یہ پیغام بھی دیا۔

"میں ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھتی ہوں جہاں کمزور اور طاقتور ملک کا فرق مٹ جائے۔ فساد کے تصور کو ہمیشہ کے لئے سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ جس میں کوئی ظالم نہ ہو۔ کوئی مظلوم نہ ہو۔ جہاں فکر آزاد ہو۔ انسان حفاظت سے اور سکون سے تعمیر و ترقی کے مراحل طے کر سکے۔ جہاں نئی نسل اپنے مستقبل کو تاریک نہ پائے"۔

(میرا بچپن ساگ اور باجرے کی روٹی کھانے والے بچوں کے ساتھ گزرا۔ ان کے لئے اپنے گھر میں ہمیشہ چوریاں کیں۔ ایک بار پکڑی گئی۔ مرمت ہوئی۔ ذرا سمجھ دار ہوئی تو اپنی پٹائی کے خلاف احتجاج کیا۔ چوری یقیناً بری بات ہے۔ چوری کوئی معمولی وارداتوں میں نہیں ہوتی۔)

فیض صاحب نے خدیجہ پر افسانے کے مجموعے پر لکھا ہے

"خدیجہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ۔"

کیا مطلب ہوا۔ کشیدہ کاری میں بھی تصویر کی آؤٹ لائن اور رنگوں کے شیڈ آجاتے ہیں کپڑے پر۔ ہو سکتا ہے سوئی کی نوک کی طرف اشارہ ہو۔ تو چبھن تو ہوتی ہے۔ جملوں کے نوکیلے پن پر۔ کبھی کبھی تو نشتر کا کام دے جاتے ہیں۔

اور خدیجہ اپنے اندر لگے ہوئے نشتر چپکے چپکے نکالتی رہی۔ لہولہان تھی مگر ادب کو اس نے چار ناول اور چار افسانون کے مجموعے دیئے۔ اور زمین کے قرض کو بھی چکا گئی۔ جو اہل دل ہوتے ہیں تو ایسے ہوتے ہیں۔ جو وہ تھی۔ جو دنیا نے اس کو دیا تھا۔ وہ اپنا دامن جھاڑ کر سب کو بتاتی۔ اسے کوئی احساس کمتری نہ تھا۔ خدیجہ اور ہاجرہ میں ایک سال کی چھوٹائی بڑائی ہے۔۔ ایک ساتھ لکھنا شروع کیا۔ مگر دونوں مختلف فکر اور سوچ کی مالک۔ اور محبت دونوں میں ایسی جیسے ایک جان دو قالب۔

طفیل صاحب نے خدیجہ پر ایک طویل مضمون لکھا "میں چراغ حسن کی محفلوں میں بیٹھا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک کے ساتھ۔ شوکت تھانوی سے تو واسطہ ایسا تھا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کا سایہ ہوں۔ لیکن جب میں سوچتا ہوں کہ عورتوں کی شوکت حسرت سالک کون ہیں تو خدیجہ سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔۔۔"

"خواتین میں مجھے ایسی مفرح قسم کی گفتگو کرنے والی خاتون نظر نہیں آئیں۔ یہ خود دھان پان قسم کی خاتون ہیں۔ مگر بہت دلیر۔ سوائے سانپ کے کسی سے نہیں ڈرتیں۔ اللہ میاں سے بھی واجبی سا ڈرتی ہیں"۔ جی چاہتا ہے طفیل صاحب سے پوچھوں اللہ میاں سے ڈر کیسا پیار محبت میں کیسا ڈر۔ طفیل صاحب نے جہاں اور خوبیاں اور نقص ڈھکے چھپے لفظوں میں گنائے ہیں وہاں وہ پنجاب کی بہو سے یہ کبھی برداشت نہ کر پائے۔ جس کا شکوہ انہوں نے دو جگہ کیا ہے۔ طفیل صاحب کے معیار کے پیمانے خدیجہ کی حسن شناسی پر پورے نہ اتر سکے۔ بقول ان کے "میرا دل چاہتا ہے کہ یہ بے شک اردو بولیں مگر شلوار قمیص تو پہنیں۔ مگر یہاں بات ایسی ہے۔ یہ کبھی پنجابی کا جھٹکا تو

کر دیتی ہیں پنجابی سے شادی تو کر لی مگر انہوں نے آج تک شلوار قمیص نہیں پہنی۔" ویسے میرا خیال ہے پنجاب کے مردوں کو اپنے شہر کے رسم و رواج کا واقعی خیال رہتا ہے۔ طفیل صاحب سیدھے سادے تو تھے مگر پنجاب کی بہو سے صرف یہ شکایت رہ گئی تو جھوائی ٹولے کی رہنے والی مصنفہ کو بھی یہ شکایت رہ گئی کہ اس کے سسرال کی گلیوں میں اس کے افسانوں کے کردار کی بہو ہمیشہ ہندوستانی کہلائی "مہاجر" کہلائی۔۔۔ ہم سب ادب برائے ادب کے قائل نہیں۔ بلکہ ہم سب ادب برائے زندگی کے خانے میں کھڑے ہیں۔ اس زمانے کی یہ تینوں مصنفائیں۔ عینی' ہاجرہ' خدیجہ سے ملنے کے بعد طبیعت صاف ہو گئی۔ خدیجہ کے افسانوں اور ناولوں کے کردار ہر جگہ یہ کہتے ہیں۔ یہ سارا ملک میرا ہے۔ رضیہ کے منہ سے خدیجہ نے کس سادگی سے پورے پاکستان میں بکھرے ان معصوم لوگوں کی آواز سنا دی۔ "یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں۔"
رضیہ کہتی ہے اس کا نام شاداں تھا۔ مگر سارا محلہ ہی اسے ہندوستانی کہتا ہے۔ وہ بھی پاکستانی ہے۔ پھر بھی جس گھر میں جاؤ۔ وہ ہندوستانی ہی کہلاتی ہے۔ کیسے سادگی سے وہ کہہ رہی ہے۔ اور یہ سارے غم وہ خود پر سہار گئی۔ پنجاب کا گاؤں ہو یا شہر۔ ایسے ایسے جیالے پیدا کئے ہیں ماؤں نے۔ بقول صوفی صاحب کے۔

"ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے"

مجھے اس کا اندازہ ہے کہ سارے عشق پنجاب سے اور شادیاں بھی پنجاب سے۔۔۔ "آنگن" پڑھ کر جی چاہا کہ خدیجہ کو کلیجے سے لگا لوں۔ "آنگن" دوبار پڑھا کتنا بھرپور ناول ہے۔ ہمارے لئے تو گھروں کی کہانیاں ہیں۔ اتنے گھر جو چھوڑ آئے ان کی۔۔ "ٹھنڈا میٹھا پانی"۔ خدیجہ کو سب کے دکھ دھکیل کے لے گئے۔ ورنہ وہ تو ہنستا چہرہ۔ کھلی کھلی آنکھوں والی' موتیا کے پھول بالیوں میں پہننے والی لڑکی تھی' جو بچپن ہی سے قلم کی نوکوں سے جوہی' موتیا کے پھول ننھی ننھی لڑکی بالیوں کی داستانوں سے پروتی رہتی۔ وہ چاہتی تھی ہم سب کے غم اب جوہڑ میں کھلے کنول بن جائیں۔ بہت ہو چکی عورت کے کتنے روپ؟ عورت کے کتنے دکھ۔۔۔ پنجاب کے یوپی کے کھیتوں سے چرائے تھے۔۔ لکھنؤ کے گلی کوچوں کے خواب جب پنجاب کے سنہرے کھیتوں میں آنکھ مچولی کھیلنے لگے تو نئی سرزمین پر نئی نسل کی پرورش پنجاب کی پذیرائی سے ہو رہی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دلی سے "آجکل" رسالہ نکلا۔ یہ دونوں بہنیں برابر اس میں چھپتیں۔ جوش صاحب سے پہلے رسالہ آجکل آغا محمد یعقوب داداشی "آجکل" کے ایڈیٹر ہوئے۔

ایک دن داداشی عامو نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی ڈاک میں سے خط نکالا۔ لو پڑھو۔ وہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ کا تھا جن کے افسانے "آجکل" میں چھپتے ہیں۔ داداشی عامو ساری ڈاک گھر لاتے اور افسانوں، مضمونوں کے بنڈل کھولتے جاتے۔ اور میں بھی پڑھتی جاتی۔ کیونکہ "آجکل" ہی ایک رسالہ 'ادیبوں کو تھوڑی بہت قیمت ادا کرتا تھا۔ اس زمانے میں دس روپے سے بیس روپے تک ہدیہ مقرر تھا۔ میں خدیجہ' ہاجرہ کو بغیر دیکھے ہی میں اپنا سمجھنے لگی۔ کارڈ پر لکھی ہوئی تحریر اور تین افسانے ایک ساتھ جیسے چپکے سے کہہ رہے تھے' جلدی سے پیسے بھیج دیجئے۔ چاہے اس مہینے یہ چھپیں نہ چھپیں۔۔۔۔ اس تحریر کا مطلب داداشی عامو بھی نہ سمجھے۔ سوائے میرے۔ ایسی ہی عجلت مجھے بھی ہوتی تھی۔ جب مجھے دس روپے ایک "نعت" کے پڑھنے کے ملتے تھے۔ اور اگر چیک دیر میں ملتا تو ن۔ م۔ راشد کی چائے بھی زہر لگتی۔ میرا چیک جلدی سے منگوا دیں مجھے جانا ہے۔ اور وہ دوسرے پروگرام کے لالچ میں "کونٹریکٹ ابھی آتا ہے کچھ دیر بٹھا لیتے۔ مجھے لگا کہ داداشی عامو بھی ان بہنوں کے ن۔ م۔ راشد ہیں۔ میں تو اپنی فیس دس روپے سے زیادہ نہ کرا سکی مگر داداشی عامو سے ایک افسانے کے پندرہ روپے کروا دیئے۔ ان دونوں بہنوں کے۔۔ اس زمانے کی لکھنے والیاں' ہاجرہ خدیجہ کی ہم عصر لکھنے والیاں' نئی زمین نئے آسمان کے خواب دیکھ رہے تھے۔ نئے نشیمن کی تلاش میں یہ ہم رکاب تھے۔ خاندان کے خاندان تلپٹ ہو رہے تھے۔ ادب برائے زندگی تھا سب نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا تھا۔

ابتداء؟ اے عورت! تو خدیجہ کے احسان نہ بھولنا کیونکہ اس نے تیرے لئے' تیرے بچوں کے لئے سارے ہی غم آہستہ آہستہ چوس لئے۔ یقین نہ آئے تو اس کی پانچوں کتابیں پڑھ ڈالو۔ وہ عورت جو چپکے چپکے سب غم دل پر سہہ گئی اور میری تمہاری داستانیں لکھتی رہی اور طفیل صاحب کہتے تھے۔ وہ کاہل تھی۔ لحاف میں پڑی رہتی۔ سو سو کرتی رہتی۔ اور سردی اور لحاف سے سمجھوتہ کرتی رہتی۔ انہیں کیا پتہ کسی کو پتہ نہ چلا۔۔۔۔ اس کا لکھنا' لایا ہے دل پر کتنی خرابی۔

جمیلہ ہاشمی

جس ڈھب سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں
(فیض احمد فیض)

"اگر خدا ہر شے کے اندر موجود ہے تو میرے اندر بھی ہو گا۔!"

اس نے خوشی یا اضطراب سے پلنگ کی پائینتی کو اتنا مضبوط پکڑ لیا کہ اس کی انگلیوں کے جوڑ سفید لگ رہے تھے وہ ایک دم پیلی ہو گئی۔ تم نے اس سے پہلے کبھی یہ نہیں سوچا کہ خدا تم میں ہے۔ تمہارے اندر بھی۔ تم خدا کا ایک حصہ ہو۔

نہیں آقازادی۔ اس نے دیوانوں کی طرح کہا۔ میں یہ سوچنے کی جرات بھی نہیں کر سکتی۔ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکتی ہوں۔ میرے اندر خدا کیسے اتر سکتا ہے۔ وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا سر اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔

ہاں خدا کا حصہ۔ ام سلمیٰ نے آہستگی سے کہا۔ ہانی تمہیں کیا ہو گیا۔ مگر ہانی بے ہوش ہو چکی تھی۔ خادماؤں کا ایک گروہ آیا۔ ہانی کو جگاؤ۔ مگر ہانی کہاں تھی' اس کے نازک وجود کو انہوں نے پھولوں کی طرح اٹھایا۔ کہیں سکتہ نہ ہو گیا ہو۔ پھر طبیب آئے اور اسی شام نے ہانی کو سرد مٹی تلے دیکھا' جہاں زمستان کی ہواؤں سے درخت ننگے ہو چکے تھے اور بادلوں کے گھیرے میں سورج بھی اڑتا ہوا لگتا تھا۔ ہر شے اداس بے رنگ تھی۔ ام سلمیٰ قرۃ العین طاہرہ اس نے اپنے نظریئے کی آزمائش ہانی سے کیوں شروع کی۔ ایک جاہل نوکرانی پر۔ ایک بار پھر اس پر عیاں ہو گیا تھا۔ یہ
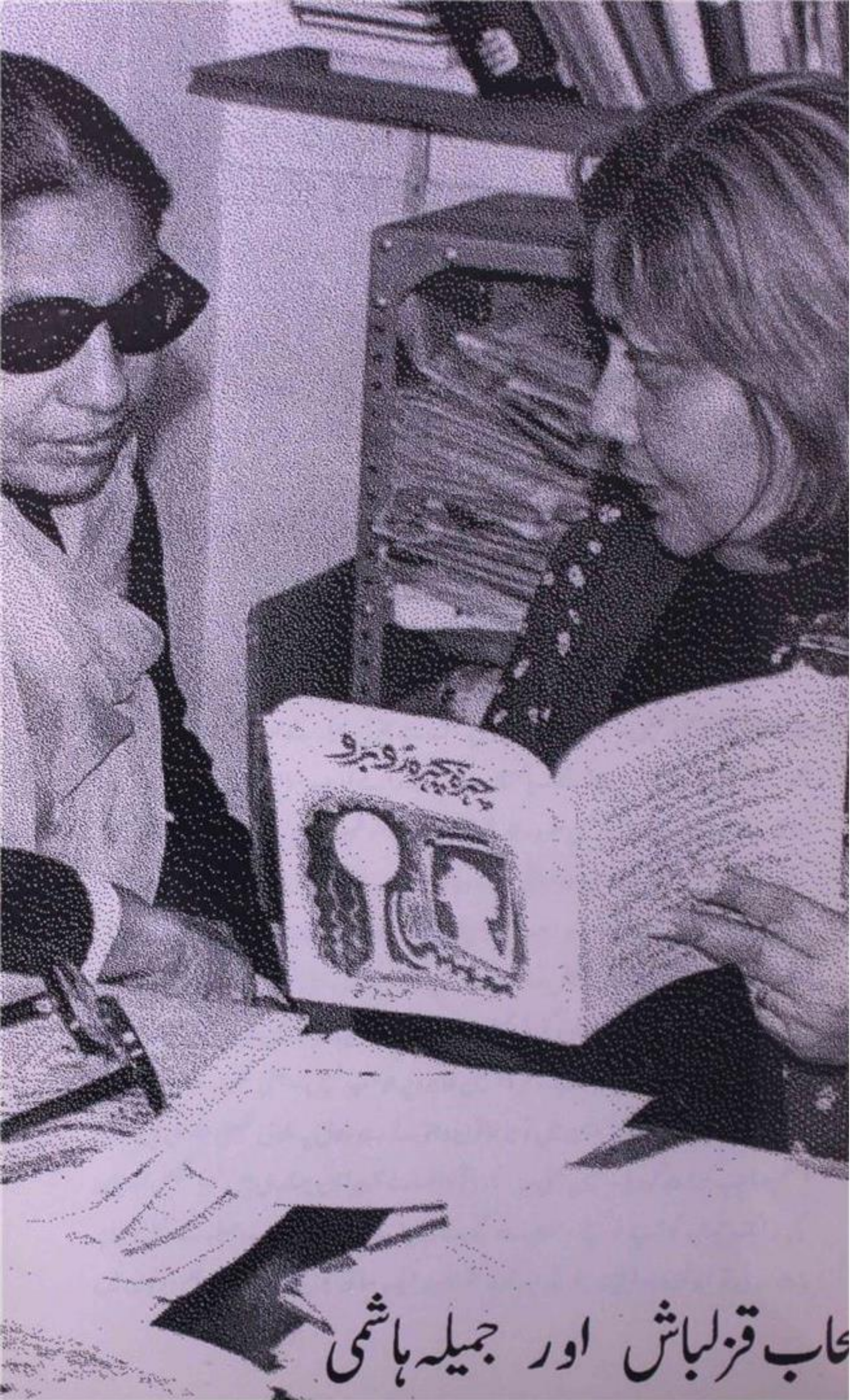
حاب قزلباش اور جمیلہ ہاشمی

سلسلہ عام لوگ کبھی نہیں سمجھ سکیں گے۔

قرۃ العین طاہرہ جو سید کاظم رشتی کے خطوط سے پہلے ام سلمیٰ تھی۔ "باب" سے ملنے سے پہلے قرۃ العین تھی۔ محمد علی بار فروش سے ملنے کے بعد زرین تاج تھی، جو نشست کانفرنس کے بعد طاہر العالم ہو گئی۔ علامہ اقبال نے بھی یہ شعر لکھے۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
میرود ان فراق تو خون دل از ددیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

جمیلہ ہاشمی آج کل لندن آئی ہوئی ہیں۔ یہ وہی ناول نگار ہیں جن کو آدم جی ادبی انعام ملا تھا۔ ممتاز مفتی اور جمیلہ ہاشمی اس انعام کے لئے نامزد ہوئے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد اردو ادب کے حصے میں بہت سی کہانیاں، افسانے آئے جن میں منٹو کا نام سرفہرست ہے۔ ناول نگاروں میں جمیلہ ہاشمی کے نام نے جو چونکا دیا۔ چونکہ امرتسر کا گاؤں جس میں جمیلہ پلی بڑھی تھیں۔ آتش رفتہ میں وہی آگ ہے بقول جمیلہ کے اردو فارسی وہاں کے سکھ مجھ سے اچھی بولتے اور پڑھتے تھے۔ پاکستان سے آنے والے ادیب شاعر جب لندن آتے تو اپنے ساتھ نئے ادیبوں کی فہرستیں بھی ضرور لاتے، کسی غریب الوطن کو کبھی رسالے اور نئی کتابیں اس کے ملک کی مل جائیں تو پھر عید ہو جاتی ہے۔ دیار غیر میں۔ انشاء کی زبان بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں معلوم ہوا جب وہ اسپتال میں تھے، یار بہت ہی اچھا لکھ رہی ہے جمیلہ، شہاب صاحب، طفیل صاحب، فیض صاحب سب ہی نے فرادا فردا نئی کتابوں، رسالوں کے بارے میں بتایا۔ ابھی حال ہی میں پاکستان گئی تو جمیل جالبی بھائی نے ایک جلسہ میں بتایا۔ بھئی جمیلہ ہاشمی آ رہی ہے۔ بڑا ہی اچھا ناول لکھا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ پر جواب نہیں۔ بھئی نظر نہ لگے۔ پانچ ناول لکھ لئے۔ توبہ جمیل بھائی پاکستان میں تو ہر خاتون دھڑلے سے ناول پہ ناول لکھتی جا رہی ہیں۔ ایم اسلم صاحب کو مات کر دیا۔ نہیں بھئی یہ تاریخ کو افسانے کا پیراہن پہنا رہی ہیں، کیا مجھیں! وہ پان کی برایک چھالیہ کو اپنے نوکیلے دانت سے کچو کے دینے لگے۔ اور آج جب جمیلہ سے ٹیلیفون پر بات ہوئی تو اندازہ ہوا جیسے بانو قدسیہ اور کشر ناہید ایک ساتھ بول رہی ہوں۔ ہم دونوں میں

اجنبیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ وہ مجھے جانتی تھی۔ میرے بارے میں کشور ناہید نے مقالہ پڑھ دیا تھا۔ ملنے کی بے چینی بڑھتی گئی۔ ٹیوب سے نکلتے ہی سامنے ٹہلتے ہوئے سردار صاحب۔ جمیلہ کے میاں اور ان کی لڑکی آشی ایسی بے چینی سے ٹہل رہے تھے جیسے ملتان کے ریسٹ ہاؤس میں کوئی بڑا انجینئر' ایکسیلنسی قسم کا صاحب کار میں سامان رکھوا کر' ابھی جا رہے ہیں یا آ رہے ہیں۔ سردار صاحب براؤن شلوار قمیص اور کالا سویٹر پہنے بڑے جاگیردار قسم کے لگ رہے تھے۔ ویسے بڑے مشہور پیر ہیں۔ لندن میں ان کے بہت سے مرید ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو جلدی پہچان لیا۔ ظاہر ہے انگریز کے ملک میں۔ بھری دوپہریا میں شلوار قمیص اور ساڑھی دونوں ہی لباس ایک دوسرے سے مانوس اور انگریزوں سے علیحدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ چلئے جمیلہ بہت دیر سے انتظار کر رہی ہیں۔ کمرے میں جمیلکہ سیاہ چشمہ لگائے کھڑی تھیں۔ مسکرا کر گلے لگایا اور مجھے لاہور میں الطاف فاطمہ سے ملاقات یاد آگئی۔ ایسا ہی سکتہ اور حیرت مجھے الطاف فاطمہ کی چیزیں پڑھنے کے بعد انہیں دیکھنے کے بعد ہوئی تھی۔ وہ عورت کہاں ہے جو یہ سب کچھ سوچتی اور لکھتی ہے۔ یہ جمیلہ ہاشمی چھ ناول لکھ چکی ہیں پھر قرۃ العین طاہرہ پر حسین ترین تاریخی ناول لکھنے والی یہ جو سامنے سیاہ سیدھے سے بالوں کا چھوٹا سا جوڑا بنائے چھینٹ کی شلوار قمیص سفید دوپٹہ سر پر اوڑھے سونے کی چوڑیاں ہاتھوں میں بھری کھڑی ہیں۔ یہ ہیں وہ ناول نگار۔

جمیلہ امرتسر کی رہنے والی ہے۔ میٹرک وہیں سے کیا۔ چھٹی جماعت میں پہلی کہانی اسکول کے لئے لکھی "ندی کی سیر" جس کو لکھنے کے بعد خود کو اور گھر والوں کو پتہ لگ گیا کہ یہ بھی پٹڑی سے اترنے والی ہیں۔

پاکستان میں لاہور سے انگلش میں ایم اے کیا۔ ماں آئیڈیل تھی۔ ساہیوال میں میکہ کا قیام ہوا۔ ماں چونکہ خود پڑھی لکھی تھیں ایک اسکول چلا رہی تھیں جمیلہ کو لڑکوں کے کالج میں پڑھنے دیا۔ شادی کے لئے سردار صاحب کا انتخاب بھی ماں ہی نے کیا۔ "آتش رفتہ" اور "تلاش بہاراں" شادی سے پہلے کے لکھے ہوئے ناول ہیں۔ شروع شروع میں جب منیر نیازی سات رنگ نکالتے تھے' ان کی چیزیں اس میں چھپتی رہیں۔ ۷ سو صفحے کی کتاب ڈیڑھ مہینے میں ختم کر لی تھی۔

اپنا اپنا جنم۔ آپ بیتی' جگ بیتی اور اردو زبان میں "روحی" نام سے ایک ناول لکھا جس میں وہاں کے گاؤں چولستان جو راجستھان کا علاقہ ہے اس پر ریسرچ کی اور ایک ناولٹ لکھا۔ پھر یہ جان لیوا ناول "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" لکھا جس کو میں نے پڑھا۔ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ جب کسی عورت

نے کوئی اچھی چیز لکھی۔ مردوں نے کہنا شروع کیا۔ "جی نہیں کسی سے لکھواتی ہیں"۔ عورتوں کو آسانی سے مانتے ہی نہیں کہ وہ لکھ سکتی ہیں۔ اس کے مجھے بھی اندازہ ہے۔ دور کیوں جاؤں ساقی نے کسی سے رازدارانہ انداز میں کہا تھا اور وہ ٹیلیفون نے اگل دیا۔ میں سنتی رہی اور آج میں خود چپکے سے جمیلہ کے بارے میں ہی سوچ رہی ہوں۔

کتنی فضول سی بات۔ کتنا اچھا ناول اردو ادب کو جمیلہ ہاشمی نے دیا۔ وہ واقعی انعام کی مستحق ہے۔ جمیلہ تمہیں تو بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ جب انعام کا سنا ہوگا۔

"نہیں۔ مجھے تو یہ حیرت ہوئی کہ میں نے تو دوسری دفعہ اسے پڑھا بھی نہیں تھا کہ اس کو انعام کیسے مل گیا"۔

مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنا بڑا اعزاز آپ کو ملے اور آپ ذرا بھی تھرل نہ ہوں۔ واقعی میرے گھر کے لوگ، سسرال والے، سب ہی بہت سارے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آئندہ سال کسی اور کو مل جائے گا۔ میں چپ ہو گئی۔ بھئی کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بات کرتے کرتے چپ ہو جاتی ہے جیسے کوئی بات ابھی یاد کر کے بتائے گی اور آپ اس کی یادداشت کا سرا ڈھونڈنے چل پڑتے ہیں۔ اندھے راستوں پر۔

اردو میں تاریخی ناول نگاری کا سہرا عبدالحلیم شرر کے سر ہے۔ نثر میں شاعرانہ تخیل کا اظہار اور نئی تشبیہات کو روشناس کرانا، قدرتی مناظر کی عکاسی کرنا شرر نے ہی اردو ادب کو دیا۔ جمیلہ نے سبھی اپنانے کی بہت کوشش کی ہے۔ قرۃ العین طاہرہ کی موت کا منظر کیسے کھینچا ہے۔ حبشی شراب کے نشے میں ہے مگر اس کا ضمیر جاگا ہوا ہے۔

تم لوگوں نے مجھے کیسی شراب پلادی جو بزدل بنا دیتی ہے۔ اسی میں قبر کی مٹی کی بو ہے۔ سیال آگ سی ارغوانی شراب دو۔

بہانے مت کرو۔ تم ایک عورت کا گلہ نہیں دبا سکتے۔

حبشی سردار کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ تم پر لعنت ہو۔ تم نے ہمیشہ کے لئے میری روح کو شرمندہ کرنے کا سامان کر دیا۔ نقاب منہ پر رکھا ہوا تھا۔ اور تانت اندر تک اتر گئی تھی۔ سفید لباس میں لپٹا بدن کپکپاتا تھا اور ساکت ہو جاتا تھا۔ سردار نے اسے ٹھوکریں ماریں۔ اس سینے پر جس میں قدرت کے رازوں کے بند دروازے کھلے تھے، بے چین پرند درختوں پر جاگ اٹھے، ہوا یکایک ماتم کرنے والوں کی طرح اٹھی اور گریہ کناں تناور درختوں کی باہیں ڈال کر سینہ کوبی کرتی رہیں۔

رات ایک دم سیاہ ہو گئی۔ ستارے چھپ گئے' گھوڑے ہنہناتے ننا ہیں تڑا کر بھاگ نکلے جیسے قیامت پلٹ آئی ہو۔

سردار گل عزیز خان نے اس جسم کو گھنوا کر اندھے کنوئیں میں لڑھکا دیا۔ سنگ بار کرنے کے بعد اور خشک پتوں سے ڈھانپ دیا' پھر آسمان پر بجلیاں تڑپیں' تیز بارش ہوئی' کیا یہ خون ناحق تھا' آخر یہ عناصر کیوں پریشان تھے۔ کبھی کبھی آسمان اپنی دوری کے باوجود زمین کے معاملے میں بھی دخل دیتا ہے۔

جمیلہ کیا خوب صورت لکھتی ہیں۔ ڈھلتی شام میں فاصلے پر پہاڑوں کا سلسلہ نیلی دھند میں چھپا ہوا تھا۔ بادل اونچے درختوں پر گر رہے تھے۔ پرندے زن زن گزرتے اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہے تھے۔ پھلوں کی نترم و نازک پتیاں دن کی تمازت اپنے اندر اتارنے کے لئے اپنے دروازے پتنگوں اور آوارہ کیڑے مکوڑوں پر بند کر رہی تھیں۔ ایک مومن آیا اور باریابی کی اجازت چاہی۔ وہ بہت دور سے آیا تھا' گرد سفر اس کے عمامے' کپڑوں اور پلکوں تک پر اور تھکن سے ادھ موا تھا۔ پیغام لانے والا خوف سے سہما ہوا تھا کہو ڈرو مت! قرۃ العین نے کہا۔

کبھی ایسا نہیں ہوا پر ہو گیا۔ وہ سجدے میں گر گیا۔ قزوین میں منادی کے ذریعے خاص و عام کو مطلع کیا گیا کہ آپ اور ملا محمد ازدواجی زندگی کے ساتھ نہیں رہے۔

ام سلمیٰ نے پردہ چھوڑ دیا۔ رنج کے بغیر کچھ محسوس کئے بنا خاموش ہو گئی۔ شام رات میں ملی۔ ہوا نے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ پھولوں کے سر ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

طاہرہ ایران کی ایک مشہور سحر البیان شاعرہ جس نے "باب" کو آئیڈیل بنایا۔ ان کی مدھم سے مدح سرائی کی۔ اس نے نئی مذہبی راہ اختیار کی اور مذہبی رہنماؤں نے اس کا راتوں رات گلا گھونٹ دیا۔ اندھے کنوئیں میں دفنا دی گئی۔ جمیلہ نے تاریخ کا چہرہ مانگا اور اپنے دکھ درد' آرزوئیں سارے ہی غازے جمع کر کے عروس ایران سجا دیا۔ لوہے کے عزم رکھنے والی شاعرہ کا تصور اپنی روح کا اداس پن فلسفیانہ سوچ کو لفظوں کے حسن سے بھر دیا۔ جمیلہ نے بہت سی حساس عورتوں کے ٹکڑوں کو جمع کر کے قرۃ العین کا روپ دیا۔ مگر عزم و فکر کا ماحول طاہرہ کا اپنا ہے۔ جمیلہ نے اندر چھپے ہوئے حزن وملال کا رخ طاہرہ کی زندگی میں ڈبو دیا۔ مارتھا لوئی کا انگریزی ناول جو طارہ کی زندگی پر ہے پڑھا۔ لاہور کی لائبریری میں بیٹھ کر فارسی' انگریزی ادب پڑھا۔ ایران کے مذہبی فرقوں کو پڑھا تو پھر کہیں جا کر یہ طاہرہ کو روبرو لائیں۔ چہرہ بہ چہرہ۔ قرۃ العین طاہرہ پر یہ

ناول افسانوی ماحول لئے ہوئے ہے۔ حافظ و سعدی کے شہروں کے روز و شب اس کے پاس بیٹھے دیکھے پڑھے۔ اس کی اپنی زبان میں جس کو سن کر ایران و دمشق سے کمند لگا کر بہاولپور میں بیٹھی جمیلہ کو بھول نہیں سکتے۔ کلیشے ؟ کا پر اسرار پن کہیں کہیں بے ساختہ ایران سے واپس لا کر جمیلہ کی تعریف کرواتا ہے۔ تاریخ کے دامن کو مذہبی فرغل پہنانے والی کا اگریں چہرہ اب بھی دیکھتی ہوں تو پھر خدشات مجھے واپس لے جاتے ہیں جو لفظوں کو بولتے وقت ایسے توڑتی ہیں جیسے گیلے پالک کے پتوں کو توڑنے پر آوازیں۔ بے دردی سے لفظوں کو استعمال کرتی ہے مگر سوچ میں تحریر ندرت لئے مخملی پردوں میں سے چھپی نکلیت ہے۔ دیکھئے عمر کی منزلیں کیسے بانٹ گئی۔ ایک جگہ لکھتی ہے۔

تیرہ سال کی عمر روشنیوں سے آنکھوں کو چندھیانے کے لئے بنی ہے۔ دور کے خواب دیکھتی دنیا کے دام فریب میں ایک لڑکی کو باندھنے کے لئے مضبوط رشتوں سے بنی ڈور پھرتا ور درخت بننے کے لئے جڑیں اندر اندھیروں میں اتریں جن کے سبز پتوں سے لدی ہوئی پھولوں کے ممکنات کو سمیٹتی ہوئی ڈالیا' ملاں محمد اور ام سلمیٰ کی زندگی درخت پر چکار ہوئی۔ بچے ان کے باغ میں کچھ دن کھیلے وہ ماں بن کر سیراب کرنے لگی۔

وہ شواب بھی کہتی دبی آگ شدید ترسناٹے کی سی کیفیت اب نہیں تھی۔ جب ہوا بند ہو جائے تو گرج کی صدا سننے کے لئے کان کھلتے ہیں۔ بچوں سے پرے جب وہ نیلے آسمان میں اترتے پرندوں کو دیکھتی تو ان کے پار دیکھتی چلی جاتی۔ سات پردوں کے پرے بھلا کون ہو گا اور مشاق شہسوار کی طرح وہ سوچ کی طنابیں کھینچ لیتی۔

جمیلہ جب بولتی ہے تو بولتی چلی جاتی ہے 'بے تکان' ہر موضوع پر۔ کبھی کبھی تو ایک نیک بی بی جو دوپٹہ اوڑھے کالی عینک لگائے رہتی ہے تین چر ملاقات میں جی چاہا کہ کہوں اس بی بی رانی کو سردار صاحب کو دے آؤ اور ہم تم باتیں کریں۔ اور سچ مچ وہ عورت چپکے سے نکل آئی اس روز جب اردو زبان میں لکھی ہوئی کتاب روحی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ امین میاں کے گاؤں کا اتنا اثر پڑا کہ ناول لکھ مارا۔ بہاولپور کے پاس چولستان کا علاقہ ہے راجستھان کی سرحد ملتی ہے جہاں خواجہ غلام فرید بابا نے ۱۸ سال گزارے تھے ایک جھونپڑے میں ایک جٹی پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ کیا کیا خوب شعر لکھے ہیں سرائیکی میں۔

دل تانگ تانگے اللہ جوڑ مانگے

وہ آنکھیں بند کر کے سرائیکی شعروں کا مطلب سمجھا رہی تھی۔ شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے۔

تم تو بادشاہ ہو میں غریب تم لوٹ کر نہیں آؤ گے

جمیلہ کے خشک ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جمیلہ کی روح کی پیاس اس کے ہونٹ پر پپڑیوں کی صورت چھاتی چلی گئی۔ وہ محبوب کی فرقت میں خود اداس نظر آرہی تھی جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ اٹھارہ سال بابا غلام فرید نے اس جتی کے لئے ایک جھونپڑے میں گزارے اور پہلی دفعہ اس کی بند آنکھوں کے نیچے محبت کے خشک صحرا نظر آئے۔ اس کی روح پیاسی ہے۔ اس کے دل میں محبت کی لو ابھی جل رہی ہے۔ قرۃ العین طاہرہ نے بھی پرستش کی تھی ایسے دماغ کو جو علم سے مزین تھا۔ ساری راحتیں اسے میسر تھیں۔ مولوی باپ کی بیٹی مولوی کی بیوی تھی۔ علم کی روشنی تھی۔ محبت کے صحرا میں پیاسی بڑھتی گئی۔ اور جمیلہ کی پیاس بھی اب چہرے پر بکھرنے لگی ہے۔

دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم

نخشب جارچوی

نخشب جارچوی

پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا

تو یہ مصرع نہ جانے کیوں میں اکثر ہر ایک کے مرنے پر پڑھا کرتی تھی۔ قاعدے کی رو سے مجھے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھنا چاہئے۔ مگر چونکہ ہر بات ہی الٹی ہوتی ہے میری۔ تو آج یہ تصور اور خوف۔ اتنی دل کی گہرائیوں سے یہ چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ تمہاری محبت کی انتہا کہ ابھی کچھ دیر پہلے لوگ جسے رو رہے تھے' اس کو اپنے ہاتھوں سے کئی من مٹی کے نیچے دبا آئے۔ چند گھنٹوں بعد پلاؤ کے نوالوں میں سسکیاں اور آہیں دب جائیں گی۔ آج اس قالین کے ڈھیر کے پاس جو تمہاری اس چوکی کے پاس رکھا ہے جس پر تم کل لیٹے تھے' مجھے کیسا سکون مل رہا ہے۔ اور میرے پیروں کے قریب میری نظروں کی حدود کی زد میں آتے ہوئے کتنی ہی خواتین کے چہروں کے پاس پلاؤ کی بھری پلیٹیں۔ گرم گرم پلاؤ کی بھاپ سے ان کے چہرے دھندلائے نظر آ رہے ہیں۔ بھوک نے ان کا سوچنا بند کر دیا ہے اور کچھ بوڑھی خواتین جو ابھی تمہاری اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر انہیں نڈھال کر چکی تھیں' اب ان کے ہاتھ تیزی سے پلیٹیں صاف کر رہے ہیں۔ تمہاری اماں نے بھی کئی دفعہ کھڑکی کی جالی کے باہر آسمان خالی نظروں سے دیکھا۔ خالہ جنہیں تم بہت پیار کرتے تھے۔ صبح سے اسی چوکی پہ بیٹھی زینے کی طرف بار بار دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں نکلا۔ سنا ہے تمہیں اتنی پیاس لگی تھی کہ تم پانی کے گھڑے چڑھا گئے۔ تمہارے نوکر نے اور خالہ نے اب تک پانی نہیں پیا۔ نوکر اپنے کمرے میں بند ہے۔ بانو باجی تمہاری اکلوتی بہن تھوڑی

تھوڑی دیر بعد ان کی ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔ آنکھوں پر ہاتھ اور دوپٹے میں سے کھلے بال۔ بانو باجی کے زانو پر نیل پڑ گئے ہیں۔ وہ بین کر رہی تھیں۔ میرا بھیا۔ میرا ماں جایا وہ ماں جس نے تم کو جنم دیا۔ وہ تمہارے چہرے کی جانب بلائیں لے رہی تھی۔ تو اتنا پیار مجھے تڑپا گیا۔ مجھے یقین ہے نخشب تم تو بہت خوش ہو گے۔ اس سین پر۔ اتنے لوگ تمہیں اتنا چاہتے ہیں۔ تمہیں تو پتہ ہی نہیں تھا۔ آج تو کوئی بھی تم سے نہ چھپا سکا۔ تم نے بڑی بڑی آنکھوں کے بھرم چھین لئے۔ میں نے تم سے معافی مانگ لی۔ اپنے کڑوے رد عمل کی۔ اصل میں تم خود ذمہ دار ہو۔ خود دور کھڑے رہے اور انوربائی مرحومہ سے جسے تم چاہتے تھے رائے پچھوائی۔ میری وہی رائے تھی جو انوربائی کے دل کو پسند تھی۔ تم نے سوچا۔ عورت عورت کو بتا دیتی ہے۔ راز..... میں تو عورت کم تھی خود سر زیادہ۔ مجھے اس زمانے میں بھاگنے کی عادت تھی۔ میں نے کسی کو ٹھہر کر نہیں دیکھا۔ جو راہ میں نظر پڑا۔ دیکھتی گزر گئی۔ نہ جانے طبیعت میں ایسی تیزی تھی کہ جیسے راہ رو بچھڑ جائیں گے۔ میں تنہا رہ جاؤں گی۔ چلنے والوں کے قدموں کے نشان پر چلتی گئی۔ کسی بھی چہرے کو غور سے نہ دیکھا۔ آواز جرس کی مٹھاس سے تسکین تو ہوتی تھی۔ مگر ڈرتی تھی ان کڑوے کسیلے فقروں کو سمجھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ کسی کی زبان سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی اس زمانے میں۔ انوربائی جب گاتی تو اس کی مسکراہٹ سے مجھے گھبراہٹ ضرور ہوتی۔ پر دکھ بھری آواز مجھے بہت اچھی لگتی۔ میں سوچتی یہ تم سے ملتی ہے۔ میرا ذکر یہ تم سے کرتی ہو گی۔ میں گھبرا جاتی اس سے۔ وہ اچھا گانے والی تھی۔ آگرے کی گائیکی کے استاد اسد علی خان اور انوربائی دو ہی تو گانے والے رہ گئے تھے۔ میں ان کے گانے کی عاشق تھی۔ جلتی بھی تھی۔ نہ جانے میں سوچتی اتنے اچھے خوبصورت راگ مجھے پھر دنیا میں لے آتے۔ تانپورے پر وہ اپنا چھپا چہرہ ٹکا دیتی۔ تھکن اس کی آواز میں بھی تمہاری طرح کی تھی۔ نازک سی۔ چنا ہوا دوپٹہ پہنے۔ ہیرے کی چمک آنکھوں میں چھپائے جب وہ اسٹوڈیو میں آئی تو مجھے لگا کہ ایسی ہی کسی نوخیز کو دیکھ کر میر نے کہا ہو گا۔

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ننھا سا دہانہ جو پان سے بھرا رہتا تھا۔ آپ نخشب صاحب کو جانتی ہیں۔ اس نے کہا تھا؟ نخشپ نگران کے منہ سے ہمیشہ پ نکلتا۔ قوام اور چھالیہ کی زیادتی سے ہمیشہ پ نکلتا تھا------ مسی

میں ڈوبے ننھے ننھے دانت۔۔۔اور میں جیسے جل ہی تو گئی۔ آپ ڈیٹیل لکھوائیں کون سی غزل گا رہی ہیں۔ کس شاعر کی ہے۔

جی ہاں لکھیے۔ غزل نخشب۔ وہ اور مسکرائی۔ اس کو جیسے معلوم تھا کہ میں چڑ رہی ہوں۔ ایک روز تو غضب ہی کر دیا۔ میں نے سنا ہے آپ سے۔ آپ سے۔ جیسے بم پھٹ گیا۔ آپ مجھ سے فضول باتیں مت کیجئے۔ میرا کام ہے اناؤنسمنٹ کرنا۔ آپ کا کام ہے گانا۔ فضول لوگوں کے ساتھ آپ میرا نام کیسے لے سکتی ہیں۔

اور میں نے اپنے آپ کو ایک ڈولی میں بٹھالیا۔ بڑی آئیں شریف عورتوں کا نام لیتی ہیں۔ اور پھر ایسی بات بھلا کوئی اور بھی سن لیتا۔ میرا جی چاہا ابھی گھر جا کر دوڑی ہوئی، سرخوش بھائی کے پاس شکایت کروں۔ تم نے ریڈیو سے جمعہ کو نعت پڑھنی شروع کی تھی۔ ہر جمعرات کو آتے تھے۔ اتوار کی شام کو میرٹھ چلے جاتے۔ پھر کچھ مہینوں کے بعد تم دلی میں میرے گھر ضرور آتے۔ مگر سامان رکھ کر، کلاسیکی موسیقی سیکھنے چلے جاتے۔ تمہیں راگوں سے پیار ہو گیا تھا۔ یہ ایک روز انور بائی نے بتایا تھا۔ نخشب صاحب میرے ریاض کے وقت آجاتے ہیں ہر روز۔ سوتے آپ کے گھر پر ہیں نا۔۔۔ میرے گھر نہیں۔ مردانے میں جہاں میرے بھائی کا دفتر ہے۔ ہم لوگ اپنے گھر پر زنان خانے میں رہتے ہیں۔ وہ میرے بھائی کے دوست ہیں۔ نعت پڑھنی ہوتی ہے اس لئے وہ میرٹھ سے آتے ہیں۔ ویسے نہ جلتے ہوئے بھی میں جل رہی تھی۔ انور بائی کے لہجے میں طنز اور چھچھور پن کتنا تھا۔ جس دن بھی میں نے جل کر سوچا تمہارے بارے میں اور تمہاری آواز دوسرے کمرے سے آجاتی۔

اماں جان میں آگیا۔ رات کو کھانا کھاؤں گا۔ تم امی کو اطلاع دیتے۔ اور میں حیران رہ جاتی۔ جیسے تم ابھی ابھی انور بائی سے مل کر آئے ہو۔ اس نے ساری باتیں بتادی ہوں گی۔ اور تم رات کا کھانے کھانے کی اطلاع دے رہے ہو کہ مردانے میں کھانا لگے گا۔ دس پندرہ سال میں، میں نے تم سے کل دو دفعہ باتیں کیں۔ شروع شروع میں تم نے بہت باتیں کرنی چاہیں۔ امی سے باتیں کرتے کرتے مجھ سے بھی مخاطب ہو جاتے۔ نہ جانے تم کو کیسے پتہ لگ جاتا کہ میں بھی باورچی خانے میں آگئی ہوں۔ مگر میں نے تمہاری باتوں کا کبھی جواب نہیں دیا۔

تم مجھے چھچھورے لگے۔ جب تم سنجیدہ ہو کر باتیں کرتے تو مجھے تم سے ڈر لگنے لگتا کہ کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔ میں ان متضاد عادتوں میں تمہارے ساتھ کچھ دور بھی نہ چل سکوں گی۔ یہ بات میں نے

تم کو پونا سے مشاعرے سے واپسی پر بتائی تھی۔ جب تم زندگی میں پہلی بار انسانوں کی طرح ملے تھے۔ اس رات تم پر عجیب اثر تھا۔ سارے راستے تم مجھ سے ایسی باتیں کرتے رہے کہ اگر میں کہتی تم پیدل آجاؤ تو تم کہنا مان لیتے۔ اور مجھے تم پر رحم آنے لگا۔ تم ہار مان گئے تھے مجھ سے۔ میں ایک ہمدرد کی طرح تمہاری ہر مشکل میں کام آسکتی ہوں۔ مگر ہم دونوں بہت مختلف ہیں۔ میں نے بڑی سلیس زبان میں تم کو بتایا تھا۔ پونا کے مشاعرے کے بعد تم کو شاید یقین آگیا کہ میں لکھ لیتی ہوں۔ اور تم نے مجھے اپنے ساتھ بٹھانا چاہا۔ اپنی پارسائی کی لسٹ گنواتے ہوئے۔ مجھے تم ایک تنہا بچے سے لگے۔۔۔۔

تم نے لتا سے لے کر حمیدہ طیب جی تک گنوا دیئے کہ فلاں بھی تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ فلاں بھی۔ فلاں کے ساتھ تم رہتے رہے۔ نادرہ کے ساتھ ضد میں۔ آخر کس سے تھی یہ ضد۔ سارا بمبئی تم پر مرتا ہے۔ ایک تم ہی ایسے ہو جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں مگر اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ تمہارے اور اپنے خاندان کے سیدھے سادھے معصوم سے رشتے کو توڑے بغیر۔ اس میں کتنا خلوص ہے۔ کتنی محبت۔ اور اسی وجہ سے تم میری آج عزت بھی کر رہے ہو۔ مجھے بھی دکھ ہے۔ تم اگر میرا ذرا بھی کہنا مانتے ہو تو ایک کہنا مان لو۔ اور تم خوشی سے اسٹیرنگ پر لیٹ گئے۔ مجھے بھی تم اس وقت اچھے لگ رہے تھے۔ آندھرا کی سڑکوں کی روشنیوں میں تمہاری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ تمہارا خیال تھا کہ میں جو بات کہنے والی ہوں اس کے بعد میں تمہاری بات مان کر گھر کے ایک کونے میں سعادت مند عورتوں کی طرح ساری زندگی تمہاری خدمت گزاری میں گزار دوں گی۔ اور آخر کار تمہاری "انا" تم جیت جاؤ گے۔ مگر میں بھی بڑی ڈھیٹ تھی۔

میرے دولہا نہ جا۔ تمہاری ماں تم سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ تم جیسے ضدی اس وقت کیسے خاموش' سفید چادر میں لپٹے' روٹھے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ سفید شیروانی جو تمہارے کمرے میں اب بھی خالی لٹک رہی ہے۔ پنکھے کی تیزی سے اس کا دامن اڑ رہا ہے۔ اس شیروانی کے اندر' اس دبلے پتلے نخشب کی سفید شیروانی ابھری۔ تم دولہا بنے کھڑے ہو۔ میرے سامنے' اور میں لاکھ اپنے آپ کو بھگانے کے باوجود تم سے پردہ نہ کر سکی۔ تم میرے سامنے کھڑے تھے۔ پہلی بار' پھولوں سے ڈھکا ہوا سارا سینہ۔ اور میں تم سے نظریں نہیں ملا سکی تھی۔ مجھے معلوم تھا تم مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ امی سے باتیں کر رہے تھے۔ یعقوب بھائی کی بیوی سے باتیں کر رہے تھے۔

تمہارے ٹوٹے ٹوٹے جملے میرے لئے کافی تھے۔ اندر میرا دل اس طرح کانپ رہا تھا، جیسے تمہارے سہرے کی لال ہری پنیاں کانپ رہی تھیں۔ اور آج تمہارے جنازے پہ پھولوں کی چادر پڑی ہوئی۔ ہری لال پنیاں بھی اداس ہیں۔ کاش اتنے لوگ نہ ہوتے تو میں تم کو چھو کر دیکھتی جیسے تمہارا دل دھڑک رہا ہو۔ تم برف کی سلوں کے اوپر سوتے رہے اور میں اپنے جسم میں یہ ٹھنڈک محسوس کرتی رہی۔ تمہارا دل بھی تو برف جیسا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ۔ تمہاری شیروانی میں جیسے سکون تھا۔ میں نے اسے چھوا بھی تھا کہ تم دیکھ نہ سکو۔ میں نے پہلی بار تم سے معافی مانگی۔ کوئی اور نہیں تھا، تم تھے اور میں۔۔۔ خدا سے میں نے تمہارے لئے دعا مانگی کہ وہ تم کو بخش دے۔ میری بد تمیزیاں جواب مجھے بہت تکلیف دے رہی ہیں۔ کاش مرنے سے پہلے تم سے مل لیتی۔ میں نے ہمیشہ ہی تم سے پردہ کیا۔ سب کے سامنے جاتی۔ تم آتے تو پہلے ہی کمرے سے غائب ہو جاتی۔ نہ جانے یہ ضد کیوں ہوئی، مجھے نہیں معلوم۔ گھر میں سب کو ہی معلوم تھا کہ میں تم سے چڑتی ہوں۔ مگر آج جیسے ساری کدورتیں دھل گئیں۔

کاش تم اتنی جلدی نہ مرتے۔ تم نے مجھ سے کہا جاؤ۔ میری ماں کو سنبھالو۔ مجھے سکون ہو گا۔ میں تمہارا ہر کہنا مان رہی ہوں۔ اب غلاموں کی طرح۔ تم نے مجھے معاف کیا۔ بتا دو۔ میں روز تمہارے گھر جاتی ہوں۔ دیکھو سرخوش نے پوری رات ٹہل کر گزار دی بے چینی میں امی۔ بھائی سب سے جیسے ہمارے گھر میں سے تم ابھی ابھی قبرستان چلے گئے۔ ہماری فیملی کے ممبر تھے نا تم بھی۔ یہ آج معلوم ہوا۔ ہم سب تم کو خونی رشتے کی طرح کیوں چاہتے ہیں۔ میرٹھ کے گھر کے علاوہ تمہارا گھر دلی میں بھی تھا۔ بمبئی میں گھر تھا۔ اور اب کراچی میں تم نے ہم سے ملنا بند کر دیا۔ میری شکل صرف دو دفعہ دیکھی۔ دونوں دفعہ یہی تقاضا اپنا بچہ مجھے دے دو۔ اس روز امی اور میں بندر روڈ جا رہے تھے۔ تم نے میری گاڑی کے ساتھ اپنی گاڑی ملا دی۔ امی جان آداب۔ دیکھئے سلطانہ سے یہ اس کا لونڈا دلوا دیں۔ جتنے پیسے چاہے لکھوا لے۔ یہ مجھے دے دے۔ اور امی نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نخشب تم ابھی تک بچے ہو۔ ویسے ہی۔ برسوں ہو جاتے ہیں تمہاری شکل دیکھے۔ اب تو تم ہم کو بھول گئے۔ تم وہ نخشب ہی نہیں رہے۔ نہیں اماں جان میں وہی ہوں۔ یہ نخشب نہیں بدلے گا۔ آپ اس سے یہ لڑکا دلوا دیں۔ بس بچے کی تمنا۔۔۔ میرا بچہ مجھی سے خرید و۔۔۔ تم آخر تک مجھے تکلیف دینے سے باز نہیں آئے۔ روپے دے کر خریدو گے۔ گاڑیاں بندر روڈ پر نزدیک نزدیک چلتی رہیں۔ تم میرے چہرے پر دکھ چرا کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔

اس خوشی سے اس فتح پر --- تم بندر روڈ چلتے ہوئے لوگوں کو کچلنا چاہتے تھے۔ اتنے سرشار تھے ---- پھر میں نے اس کو دکھ دیا۔ اپنی انا کے سہارے ساری عمر جئے -------

وہ جو ایک شریف گھرانے کی سنہری دوپٹے میں لپٹی گٹھری، جلالی کی مسجد میں جس سے تمہارا نکاح ہوا ہے، وہ شریف میری ہی طرح کی ایک عورت۔ تمہارے سارے ہی کہنے ماننے والی عورت۔ تمہاری منکوحہ بیوی جواب تک اسی سادگی اسی محبت سے تمہارا انتظار کر رہی ہے کہ کبھی نہ کبھی تم زیور اور کپڑوں کی پٹلیا لے کر آؤ گے۔ اس کو بلالو گے۔ اس کو تم اپنے سارے قاعدے قانون سکھالیتے، وہ سب خوشی خوشی تمہارا کہنا مان لے گی اس کا تو پلو بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ تمہیں کالج اسکولوں سے نفرت تھی، لڑکیاں اماں جان خراب ہو جاتی ہیں۔ بقول تمہارے تم اماں جان سے کہا کرتے تھے۔ اماں جان لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں زیادہ پڑھ لکھ کر۔ تم نے اکثر میری ماں کو ورغلایا تھا۔ کجا مردوں میں نوکری کرنا اس سے بھی قابل نفرت بات تھی۔ میں نے تمہاری بہت منت کی اس کو بلالو۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ سچے دل سے۔ مگر تمہاری گاڑی بمبئی پہنچنے کی تیزی میں سو سے اوپر چل رہی تھی۔ تم مجھ سے روٹھے ہوئے تھے غصے میں چلا رہے تھے۔ میں نہ کہوں ہوں عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ تم بڑبڑا رہے تھے۔ تم جیسے بمبئی نہیں جلالی کی سڑکوں پر دوڑ رہے تھے۔ اپنی خالہ سے کہہ رہے تھے جیسے میری جگہ وہ بیٹھی تھیں۔ کار سے اترے تو صبح کی فلائٹ کا وقت پوچھ رہے تھے۔ مجھے کراچی جانا تھا۔ زینے کے اندھیرے میں ناقص العقل کا ہاتھ چڑھنے میں مدد کرتا رہا۔ سہارا دینا چاہتا تھا۔ عورت کو راہ سمجھانا چاہتا تھا۔ جسے چلنا نہیں آتا جو ساری عمر سہارے چاہتی ہیں۔ پناہ چاہتی ہیں۔ بازوؤں کی --- مگر ادھر تو الٹا ہی حساب تھا میں تو جیسے فوج بٹالین سے نکل آئی۔ آپ مجھے گیارہ بجے کار دے دیجئے گا۔ میں آپ کو تیار ملوں گی۔ میرے زور سے دروازہ بند کرنے کی آواز تمہارے دروازے سے زیادہ سبقت لے گئی تھی۔

اور پھر ایئر پورٹ پر تم ویسے ہی ہنس رہے تھے ویسے ہی مسکرا رہے تھے۔ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ سب کو سلام دعا۔ کراچی آنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھو شاید آجاؤں۔

اور تم آئے۔ اور کل تمہیں یہ لوگ منوں مٹی کے نیچے دبا آئے۔ سنا تھا تم نے پاکستان آتے ہی سب سے پہلے سنہری گٹھڑی سے ناتا توڑ لیا تھا۔ مجازی خدا نے طلاق دے دی تھی۔ اور کراچی کی مہوشوں سے تمہارا گھر اور گھوڑوں سے ریس کورس بھرا رہتا تھا۔

جیسے چپکے سے انور بائی نے مجھ سے کہا۔ یہ دس روپے کی نعت ہر جمعہ کو جو نخشب صاحب پڑھتے ہیں ان کا پیغام آپ کے لئے لاتی ہوں۔ میرے لئے؟ تو اس نے تیز نظروں سے کہا تھا جی نہیں۔ جو آپ کے بھائی کے دوست ہیں۔ جو آپ کے گھر میں رہتے ہیں۔ وہ نخشب ۔۔۔ آپ میرے بھائی کا نام کیوں لیتی ہیں۔ آپ صرف نخشب کا نام لیجئے۔ جی نہیں میں ان کو بھی جانتی ہوں۔ تو یہ دس روپے والے نخشب صاحب آپ کا بچہ لاکھوں میں خریدنا چاہتے ہیں۔ اب بولو۔ بولتی کیوں نہیں۔

تم نے میرے میاں سے کہا تھا آپ اور پیدا کر لیجئے یہ دے دیجئے۔ ابھی لکھ لیجئے۔ اس فلم کا جتنا پیسہ ہے ایک ایک کوڑی دے دوں گا۔ وہ ہنستے رہے۔ میں نے کہا۔ یہ سنکی ہیں سنکی۔ اور تمہاری روح کی تنہائیوں کا دکھ زبان میں زہر گھول رہا تھا۔

نخشب اپنے بنائے ہوئے خول میں اندر ہی اندر مرجھا رہا تھا۔ پیسے کے ڈھیر۔ محبت کی پیاس۔ وہ دنیا کی دوڑ میں بھاگ رہا تھا۔ ہانپ رہا تھا۔ ریس کورس میں ہار جیت کے امتزاج نہیں اپنے شب و روز سر کا تا جا رہا تھا۔ تنہائیوں میں یادوں کے خزانے کھولے بیٹھتا تو تلخیاں ہی تلخیاں نظر آتیں۔ اپنے دربار کی مجلس میں کھوکھلے قہقہے لگاتا۔ مجھے ۔۔ چاہو ۔۔ میں سب کچھ ہوں تم کیا بیچتے ہو۔ میں سب سے بڑا بیوپاری ہوں۔

تمہاری میں اب قدر کرتی ہوں۔ اس لئے نہیں۔ اس لئے کہ تم نے اپنے گھر کے ہر فرد کو زہر کے گھونٹ تو دیئے پر سونے کے پیالوں میں۔ اپنے عزیزوں کو چاہنا سکھایا کہ وہ تم کو یاد کریں کہ کتنوں کو دنیا میں رہنے کے لئے گوشہ عافیت نصیب ہو۔ روٹی مل جائے اور وہ تم کو یاد کریں گاڑیوں میں گھومتے وقت اپنے بچوں کو پیار کرتے وقت۔ اب گھر میں سکون ہے۔ تمہارا نوکر بہت روتا ہے۔

کل بے ہوش ہو گیا تھا۔ کہتا ہے تم نے پانی مانگا تھا۔ آخری دفعہ ۱۲ بوتل پانی پینے کے بعد' اور وہ تمہیں پکڑے ہوئے تھا۔ دو دن تک وہ پانی بھی نہیں پی سکا۔ کتنے غریب کتنے بوسیدہ کپڑوں میں' بوسیدہ برقعوں میں روتے ہوئے میری نظر پڑی وہ کس لگن میں رو رہے تھے۔ اور اس وقت مجھے تمہارے بجائے انور بائی یاد آ گئی۔ تمہارے نام کے ساتھ چنے ہوئے دوپٹے میں لمبی لمبی آنکھیں' چھپی چہرہ۔ جیسے کوئی مغل خادمہ ساغر کہیں رکھ کر بھول گئی اور خوف سے زرد ہوئی جا رہی ہے کہ جام کیسے پیش کرے۔ اس کا ساغر کھو گیا۔۔ تم بمبئی چلے گئے تھے۔ پھر مجھے پتہ لگا انور بائی پروگرام

نہیں کرنے آئے گی۔ اس کو تیسری اسٹیج شروع ہو گئی تھی ٹی بی کی۔ تو ریڈیو والوں کو خیال آیا' اب کے وہ ضرور ٹی بی کے جراثیم چھوڑ کے جائے گی اسٹوڈیو میں۔ اس کی انٹری بند ہو گئی۔ ساقی و ساغر روٹھ گئے۔ مجھے اس کا دکھ جب ہوا جب میں نے ریڈیو پر سنا کہ کل آگرے والی انوربائی کا انتقال ہو گیا۔ مرحومہ کے کچھ ریکارڈ سنے۔

میراجی چاہا کاش میں اس سے معافی مانگ لیتی۔ تمہارا کیا قصور اگر تم شریف گھر میں پیدا نہیں ہوئیں' ورنہ شریف زادی ہونے کا کومپلیکس مجھے ہمیشہ رہا اور اس شرافت کے خیال سے کئی شریف کھوئے۔ میں بہت اداس تھی کہ تم کو اس کا بہت رنج ہوا ہو گا۔ میں اکثر سوچتی کہ میں اس شخص سے اتنا چڑتی کیوں ہوں۔ سارا گھر اس کو چاہتا ہے' میں اس کو چھوڑ کر اس کے سارے گھر والوں کو چاہتی ہوں۔ مگر فقط تم سے ہی ضد۔ یاد ہے میری ضد۔ تمہارا پروگرام تھا ایک صبح میری ڈیوٹی تھی۔ اس دن مجھے سب سے زیادہ اپنی ضد کی وجہ سے شرم آئی۔ میں نے تم سے جا کر کہا کہ پلیز تم میرا آئٹم کم کر دو۔ تو وہ حیران ہوا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ میں ڈیوٹی روم میں بیٹھی بڑی خوش ہوئی جب تمہاری آواز میں لرزش تھی۔

تم امی سے کہہ رہے تھے زور زور سے نہ جانے کیمرے کے پیچھے کیسے تمہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ میں بھی ہوں۔

باورچی خانے میں امی بیٹھی اکثر تم سے باتیں کرتیں۔ کیونکہ وہ تم سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ صرف ایک میری ضد تھی کہ اس شخص کے سامنے نہیں آؤں گی۔ اسٹوڈیو میں اگر میں جا رہی ہوں تم سامنے سے نظر آئے تو میں نزدیک کے کمرے میں چلی جاتی۔ جیسے سچ مچ میرا پردہ ٹوٹ گیا ہو۔ تمہارے لئے یہی کافی تھا۔ جلنے کا سامان تم نے ایک دن امی سے کہا تھا کہ امی میں ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جس کا دامن تک سورج کی کرنوں نے نہ دیکھا ہو۔ اور میں نے سب سے ملنا شروع کر دیا۔ ریڈیو کے کوریڈور میں' لوگوں کے مجمع میں کھڑی باتیں کرتی۔ جب تم گزرتے تمہاری طرف پیٹھ کر لیتی اور ایسی بات کہتی کہ لوگ خوب ہنستے اور مجھے سکون ملتا کہ پورا سورج مجھے تمازت پہنچا رہا ہے۔

بے دردا۔ دردیا نہ جانے بائیں چھنگیا میں بیریہ اس زمانے کی بات ہے۔ اس دادرا گانے والی کا درد واقعی پہچان لیا تھا تم نے' آگرے والی انوربائی تمہاری حسین محبوبہ بھی ہاتھ سے جا رہی تھی۔ تم دلی میں میرے گھر آتے تو تھے' کبھی کبھی میرٹھ سے سیدھے ادھر چلے جاتے۔ تم دونوں کو

معلوم ہو گیا تھا کہ وقت بہت قریب ہے۔

مجھے خبریں ملتی رہتیں۔ ٹی بی کے آخری اسٹیج پر تم اسے محل بنانے کے خواب دکھاتے رہے۔ • تم غزلیں لکھتے۔ وہ گاتی۔ اور میں تنہا تمہاری آڈینس تھی۔ اس جلن' اس دشمنی کو کیا کہتے ہیں؟۔ یہ تو اب دماغ کی سیکڑوں راہوں کی روشنیوں پر ہلکے ہلکے کئی سائے ابھرے ہیں تو پتہ لگا۔ پہلے تو دروازے ایسے بند تھے۔ ان کواڑوں کا آسانی سے کھلنا مشکل تھا۔ اپنے دماغ کے اندھیروں میں ننھی ننھی کرنیں جھروکوں سے بکھری ہوئی اس صبح نظر آئیں۔ جب تم کار میں اپنی دلہن کو بٹھائے جلالی کی کچی سڑکوں پر دھچکوں سے ہوش میں آجاتے تھے۔ ایک رات کے بیاہے۔ • شرمندہ سے۔ تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ایسی تھکن تھی جیسے میلوں کے بعد اس راہ پر پہنچے ہو۔ میں نے سوچا تمہاری نظر میں اس وقت سونے سے پگھلا ہوا چہرہ تمہارے ساتھ چل رہا ہے۔ دردیانہ جانے بے دردا۔ بائیں چھنگلیا میں پیر۔ اور وہ پیر۔ تمہارے سارے وجود میں تحلیل ہوتی گئی تھی ۔۔۔۔۔۔ تم کتنے بے چین تھے ۔۔۔ اسی سرخ دوپٹے میں منڈھی گٹھری کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا ۔۔۔۔ مگر شادی کی رات جب تم نے ایسے ہی پھول پہنے تھے جیسے ابھی ابھی کالے کپڑوں پر پھولوں کا ڈھیر بچھا دیا تھا۔ اور برف کی سلوں پر تم لیٹے ہوئے تھے۔ ایسی ہی سرخ ہری پتیاں پھولوں کے ساتھ ہوا کی لرزش سے کانپ رہی تھیں۔ میرے دل کی طرح جلالی کی مسجد میں سفید جالیوں کے پاس تم اندر دولہا بنے کھڑے تھے۔ ہم سب دلی سے تمہاری ضد پر آئے تھے۔ تمہاری شادی میں' اور میں سوچ رہی تھی کہ میں تو پکنک منا رہی ہوں۔

گاؤں کی زندگی کتنی تنہا اور سنسان ہوتی ہے۔ اگر میں بھی نخشب کی بیوی کی طرح اتنے سال زندگی کے گزارتی یہاں تو پاگل نہ ہو جاتی۔ جلالی کی مسجد میں برات ٹھہری تھی۔ ایک دروازہ حسنین کاظمی کے گھر میں بھی کھلتا تھا۔ مسجد کے برآمدے میں ہم نے پلنگوں پر بستر بچھا لئے تھے۔ تمہاری جمالیاتی نظر اتنی تیز تھی۔ مجھے تمہاری خالہ کے رکے ہوئے آنسوؤں نے روک لیا۔ وہ مجھے سسکیاں لیتے ہوئے بتا رہی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کہے تھا کہ اس کے پیر اور ہاتھ کہیں اس کے بھائی جیسے بڑے بڑے پھاوڑے جیسے تو نہیں۔ میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ اور کسی نے کہا کہ وہ تو ایسے چلے ہے کہ بتاشے بھی نہ ٹوٹیں ۔۔۔۔۔ پیروں کی ساخت سے بچا کر پھر اس کی نظروں میں پہلے زمانے کی نازک اندامی کے خواب دکھا دیتے جو ایک ایک رات بتاشوں پہ ناچنے کا چیلنج کرتی تھی۔ اور پھر تم ان مہندی لگے نازک پیروں کے رقص میں کھو گئے۔ اور تمہارا نکاح ہو

گیا۔۔۔۔۔ تو تم کو ہوش آیا۔ اب تو چھپی چہرے سے تم خلوتوں میں بھی دور ہو گئے۔ دو بول
بڑے سخت ہوتے ہیں اس دنیا کے۔ نئے گھوڑے تک لگام کیسے پہنچے۔ تم گھبرائے ہوئے مسجد کے
برآمدے میں آئے۔۔۔۔۔ پریشانی سے۔۔۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ تم ڈوب گئے تھے۔ ہارے
ہوئے سے۔ سب سے باتیں کرتے پھرتے رہے۔ ہمارے پلنگوں کے پھیرے لگاتے رہے۔ اماں
اور یعقوب بھائی بیوی سے مذاق کرتے رہے۔ سب جملے مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ میں خاموش
مسکرا رہی تھی اور اپنی فتح اور شادمانی کی کرنیں چہرے پر نہ آنے دیتی۔ تم پھر اداس ہو گئے تھے۔
تھکے تھکے سے۔ اور پھر تمہاری شادی کے بعد۔ جیسے نخشب تمہارے پاس سرٹیفکیٹ آگیا تھا گھر
والوں کے لئے۔ جب بھی بمبئی کبھی مشاعرے میں گئی، سرخوش نخشب کو لکھ دیتے کہ جیسے اس کے
گھر ہی ٹھہرنا۔ اور وہ اپنی پڑوسن کے گھر مجھے ٹھہرا دیتے۔ آمنے سامنے گھر تھا نا۔۔۔۔ یہودی
عورت کا فلیٹ پندرہ بیس سال سے تھا۔ وہ بہت اچھی کرو نیک بھلی خاتون تھی۔ مگر تھی بہت
سیدھی۔ مجھے تو شریف بھی لگی۔ وہ نخشب کی دوست تھی۔ میری ڈکشنری میں لفظ دوست وہ ہے
جس سے آدمی بے تکلفی سے بات کر سکے۔ جہاں مرد، عورت کا خیال نہ ہو۔ بات کرے تو دونوں
کو یاد نہ رہے کہ یہ دونوں کسی دوسری سیکس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے دوستی۔ وہ نخشب
کا بہت خیال کرتی تھی۔ نخشب کی وجہ سے مجھے بھی بہت چاہتی تھی۔ مجھے آج وہ عورت بے پناہ
یاد آئی۔ اس نے اگر اخبار میں پڑھا ہو گا تو کتنا روئی ہو گی، نخشب کی موت پر بمبئی میں۔ ہم دونوں
عورتیں رات کو برابر برابر پلنگ پر لیٹ کر بظاہر بمبئی کی شوٹنگ اور فلمی فنکاروں کی باتیں کرتیں
مگر ہر آہٹ پر میں اور وہ ضرور ایک ساتھ چونک جاتیں کہ شاید نخشب ملنے آئے ہوں۔ میں جب
تک بمبئی میں نخشب کے گھر رہتی رات کے دس بجے تک ضرور کھانے کے بعد نخشب میرے پاس
آتے، دوسرے دن کا پروگرام پوچھتے۔ کھانے کے بارے میں پوچھتے۔ لاکھ بتانے پر کہ میں گوشت
نہیں کھاتی، پھر بھی گوشت، مرغی سے دستر خوان بھرا ہوتا اور میں سبزیاں، دال ڈھونڈتی رہتی۔
میری اور نخشب کی طبیعتوں کا فرق شروع ہی سے اتنا چیختا، شور مچاتا ہوا تھا کہ چھپے ہونے کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں بھی معلوم تھا مجھے بھی۔ میں ان سے چڑ کر۔ دلی میں سرخوش بھائی کے کہنے
کے باوجود ان سے پردہ کرتی۔ اپنی شکل کبھی نہ دکھاتی۔ دلی میں تو میں کبھی مشاعروں میں نہیں گئی۔
سوائے ریڈیو پر یا پردہ باغ عورتوں کے جلسوں میں۔

پھر اسکول، ریڈیو کی زندگی میں گرفتار تھی۔ کسی اور چیز کا دھیان ہی نہیں تھا۔۔۔ نخشب

کھانے کے بارے میں روز ہی اصرار کرتے۔ دوپہر کا کھانا کھاؤ پھر چلی جاؤ بازار۔۔۔۔ گاڑی سارا دن میرے پاس رہتی اور میں مہارانی کی طرح چیزیں خریدتی پھرتی۔ کبھی یہ بھی خیال نہ آیا' نخشب کو بھی گاڑی چاہئے ہوگی۔ وہ آتے۔ دروازہ کھٹکھٹاتے۔ دروازے کے باہر کھڑے میرا پروگرام پوچھتے۔ میرا مذاق اڑاتے اس طرح تینوں ایک دوسرے سے مل لیتے۔ نہ جانے اسے ایسی محبت کیوں پسند تھی۔ ہر شخص سے ایسے ملتا اپنے دوستوں کو چھوڑ کر جیسے اسے کسی میں انٹرسٹ نہیں' کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر جب وہ مجھے چڑاتا تو بہت سی برائیوں کے بعد' جب میں خاموش ہو جاتی یہ سوچ کر کہ جواب جاہلاں باشد خموشی' تو جیسے وہ سمجھ جاتا کہ یہ مصرع میں پڑھ چکی ہوں۔ اور خاموش ہی اب تو نہیں ہے تو اتنا نزدیک آکر کھڑا ہو جاتا۔ میری خوبصورت ساڑھیوں کے کپڑوں کو مٹھی میں دباتا رہتا۔ یہ کوئی سلک ہے۔ یہ پیسے پھینک کر آئی ہو۔ کیا رنگ لائی ہو بھئی۔ خریدنے کی تمیز نہیں؟ میری پیور سلک کی ساڑھی مہربانی سے خراب نہ کریں۔ میں گھڑوں میں کپڑے نہیں رکھتی۔ اور ململ کے کرتے کی سطح پر دل کے بے چینیاں پھیلنے لگتیں۔ آنکھیں اداس ہو جاتیں۔ تم اتنے کپڑے اتنی چیزیں گھر کے لئے لے جاتی ہو۔ کچھ پیسے بھی بچاکر لے جاتی ہو۔ ہمیشہ تم یہ کرتی ہو۔ بھلا یہ پھولدان' یہ جوتیاں کیا پاکستان میں نہیں ملتیں۔ اور اتنی ساری جوتیاں' عورتوں کو نہ جانے ان چیزوں کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ تبھی تو کہے ہیں' عورت ذات ناقص العقل ہوتی ہے۔ اور پھر مجھے ہنستے ہوئے جلا کر چلے جاتے۔ مجھے زہر لگتے۔ جی چاہتا' ابھی سامان اٹھا کر کسی ہوٹل میں چلی جاؤں۔ مگر اکیلے کیسے رہتی۔ عورتوں کو برا کہتے۔ عورت کو گھر کی چاردیواری میں رہنا چاہئے۔ باہر جاکر کام کرنا' ان کے نزدیک برائی تھی۔ پھر آخر جھک مار کر ایک سیدھی سادی شریف خاندان کی لڑکی کو بیوی بنایا۔ اس دن تو پرانی تہذیب کے شہزادے بنے رہے۔ پھر اس کو اس کے گاؤں میں چھوڑ کر' خود بمبئی شہر میں آن بسے۔ جہاں عورت مرد ایک تھے۔ سڑک پر قدم ایک ساتھ اٹھائے چلتے تھے۔

اسی بمبئی میں ایک صبح نخشب کے فلیٹ میں سرخوش بھائی بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ چونکہ ایک ہی غسل خانہ تھا۔ صبح ہی صبح نخشب کی اور سرخوش بھائی کی بحث کرنے کی آوازیں آتیں۔ اگر تم نے مجھے تنگ کیا تو میں ابھی چلا جاؤں گا۔

میں دونوں کی لڑائی کا غسل خانے سے یہ تماشا دیکھتی رہی' مردانے میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ تو لے لے بوٹی سرخوش تیرے لئے رکھا ہے۔ رات کو تو سو گیا تھا کھانا ہی نہیں کھایا۔

ہاں یار طبیعت خراب تھی۔ مگر اب انڈا کھالوں گا۔ سالن نہیں۔

کھا۔۔۔ بوٹی کھا۔۔۔ کیالذیذ قورمہ پکایا تھامیں نے۔ نصیبوں والوں کوملتا ہے۔

نہیں بے میں نہیں کھاؤں گا۔ انڈا دے دے۔

پھروہی۔ تجھے قرآن کی قسم کھانا پڑے گا۔

احمق ہوا ہے۔ میں صبح صبح سالن نہیں کھاتا۔

ہاں نہاری انڈوں کی ہوتی ہے جو دلی میں ہر صبح دسترخوان بچھا ہوتا تھا۔

دیکھ نخشب تو مجھے تنگ کرے گا تو چلا جاؤں گا۔ ابے حرام زادے یہ نہاری ہے۔ بمبئی میں بیٹھا نہاری کے خواب دیکھ رہا ہے۔ سالن صبح صبح کھالوں پال۔۔۔ او اپال۔۔۔ یہ سالن لے جاؤ۔ پھینک دو۔۔۔ جا ایسی کی تیسی تیرا تو دماغ خراب ہو گیا۔ نخشب تو نے دیکھا میں صبح نہاری کے علاوہ کوئی سالن نہیں کھاتا۔

جا جا اپنا کام کر جو تیری مرضی کھا۔۔۔

مجھ کو کام ہے، میں جا رہا ہوں۔ (خول پمن۔ نخشب تیار) کھڑکی میں کھڑے گنگنا رہے ہیں۔ جیسے شعر موزوں کر رہے ہوں۔ دوسرے برآمدے کے کھڑکی میں سرخوش شیو بنا رہے ہیں اور پھولے منہ پر صابن زر زور سے گھستے رہے۔ میں چپکے سے اپنے کمرے میں چلی جاتی کہ اب کیسے ان لوگوں کو بتاؤں کہ میں شوپنگ کے لئے تیار ہوں۔ ناشتہ کرنے کو بالکل جی نہین چاہ رہا۔ مجھے گاڑی چاہئے اور نوٹ بھرے ہوں بٹوے میں۔ اور ساری خوبصورت ساڑھیاں خوبصورت امپوریم کی خرید کر میں اپنے بکس میں بھر کر پاکستان لے جاؤں۔ وہاں تو ایک ایک منٹ مجھ پر بھاری ہوتا۔ یہی وجہ ہوتی کہ بمبئی کا ایک ہفتے کا Stay ہو تو وقت منٹوں میں گزرتا۔ نخشب سے ملاقات تین دفعہ ہوتی۔ اول اور قاعدے کی بنا پر۔ معاہدے کے اندر۔۔ صبح ململ کے مسلے ہوئے کرتے میں۔ نہ جانے انہیں کیا ارمان تھا کہ مجھ سے صبح ضرور ملتے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹاتے۔ کیا پروگرام ہے آج کا۔ پیسے لٹانے کا سامان طے ہو گیا۔ اور وہ فضول سی باتیں کرنے لگتے۔ عورت کے عقل نہ ہووے۔ ورنہ دلدر ہی دور نہ ہو جاویں۔ یہ سب پیسے واپس لے جاؤ۔ تم تو ایک ایک پائی خرچ کر کے جاؤ گی۔ بھلا ان ساڑھیوں سے کیا بنے گا۔ کچھ ہی لا دلو؟۔

آدمی کی شکل ایسی ہو تو جوتی کپڑے کوئی دیکھے ہی نہیں۔ سب عورتوں کی مرضی پر ہوتا ہے۔ وہ اور مجھے جلاتے۔ جیسے انہیں میری شکل بھی پسند نہ ہو۔ اور میں سچ مچ جل جاتی۔ اور میں طے کرتی

کہ آئندہ اس شخص کے گھر نہیں آؤں گی۔ مگر جاتے وقت ایک ایک چیز باندھی، کھانے کا اہتمام۔ پاکستان کی محبت، جیسے ان کی آنکھوں میں پگھلی جاتی۔ امی کے لئے بھائیوں کے لئے پیغام۔ بھائیوں کے لئے بے چینی۔ ایئرپورٹ تک ٹھہرے رہنا۔ اور اسی طرح کی اداسی۔ خدا حافظ کہہ کر ہاتھ دیر تک ہلاتے رہنا کوئی اور ہوتا تو رو دیتا مگر وہ اداسی کو جھٹک دیتا۔ اچھا ہے چلو جان چھوٹی۔ روز کی ڈیوٹی دینی پڑتی تھی۔ نازک مزاج خاندان والوں سے ڈر لگتا ہے۔ آغا صاحب کی طرح کب آپ بھی خفا ہو کر سامان اٹھا کر لے جائیں۔ آج آپ جائیں گی تو آرام سے پڑ کر سوؤں گا۔ میں بے اختیار داد دیتی ایسے جھوٹ پر۔ سب سے زیادہ پال کو خوشی ہوگی۔ وہ بے چارہ بہت کام کرتا۔ تم کو تو اب بے ڈھنگا بھی نہیں کہہ سکتی جو میں اکثر کہتی تھی۔ اور تمہارے منہ سے سننے کو جی چاہتا ہے کہ تم ان کالی چوکیوں پر سے اٹھ کر کہہ دو کہ باؤلی روتی کیوں ہو۔ اور وہ بھی تم اور میرے لئے رو رہی ہو۔ یعنی نخشب کے لئے کمال ہے۔ وہ نخشب جو چاہے اس دنیا میں خرید لے۔ مگر تم نے تو مجھے کبھی نہ چاہا اور مجھے اپنا بیٹا بھی نہیں دیا۔ لاکھ دو لاکھ لے لو۔ اور مجھے یہ بیٹا دے دو۔ بھلا پیسے کی آپ کو اتنی کیا تکلیف۔ آپ پیسے سے کبھی بھی کچھ نہیں خرید سکتے۔ ویسے یہ آپ ہی کا ہے۔

نہ نہ۔ میں ان فضول باتوں کا قائل نہیں۔ تم تو ٹھہریں باؤلی۔ کل روتی ہوئی آجاؤ گی۔ میرا بیٹا مجھے واپس کر دو۔ تو میں کیا کروں گا۔ تم اس کے نرم نرم رخسار اپنی انگلیوں سے مڑوڑ رہے تھے اور وہ گھبرا کر کبھی مجھے اور کبھی تمہاری دی ہوئی Coke کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ تم نے اسے بے تحاشا جنونی انداز میں پیار کیا۔ جس کی شدت اس کے چہرے پر چڑ بن گئی۔ وہ تو تم گھوڑے سدھانے کی عادی تھے۔ ریس کورس تمہارا اوڑھنا بچھونا تھا اور تم نے فوراً اس کے بدکنے سے پہلے کوکا کولا کی ایک اور ٹھنڈی بوتل تھمادی۔ میری اور تمہاری آنکھوں نے پہلی بار سمجھ میں شرکت کی ایک ساتھ۔ اور میں اور تم ہنس دیئے۔ میری خوشی تم کو کبھی اچھی نہ لگتی، سدا سے تمہاری عادت تھی۔ میں کسی پر خوش ہوئی اور تم نے میرے چہرے پر سے خوشی مٹانی چاہی۔ مجھے جلایا۔ دیکھو یہ لڑکا خدا کی قسم کہاں سے پیدا کر دیا نہ ماں کی شکل ہے نہ باوا کی۔ میں نے بھی جل کر باپ کا حصہ اجاگر کیا۔ اس کا قد میرا نہیں ہے کیونکہ میرے میاں کا قد بہت لمبا ہے اور لمبا ہی نہیں چوڑا بھی۔۔۔۔ اور تم مسکرائے۔۔۔۔ تیر پہنچ چکا تھا۔ تمہارے حلق تک۔

اس میں چچا کی جھلک ہے اور خوشی سے تمہاری آنکھیں جگمگا گئیں۔ یہ باپ کی جھلک نہیں۔ چچا

کی۔ بچا یعنی سفید شارک سلک کی شیروانی میں تم نے اپنا سینہ اور چوڑا کر کے بٹن بند کرنا چاہا۔

اچھا تو یہ آپ بچا کب سے بنے؟

جب سے تمہارا میاں اچھا لگا۔

تو گویا وہ بھی آپ کو اچھے لگے۔

ہر حسین اچھی شکل مجھے اچھی لگتی ہے۔

تو آپ کے بھائی پہلے والے ہیں یا دوسرے والے۔

پہلے والے تو کیا خبر گئے کہاں۔ دوسرے والے ضرور ہیں۔ اب تم اتنی بھی نہیں سٹھیا گئی ہو کہ اچھی شکل والے سے بھی نہ کرتیں۔ حسین تو میں نہیں کہوں گا۔ وہ تو ختم ہو گیا۔ وہ تو ختم ہو گیا۔ فقط ایک پر ہی۔۔۔ جو قسمت والوں کو نظر آتا ہے۔

کیوں بے؟۔۔۔ یہ تیرا بچا حسین ہے یا تیرا باوا۔۔۔۔

کیوں بے گلفام بولتا کیوں نہیں۔ ماں کی طرح آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا ہے۔ جب جواب نہ بن پڑے تو ایسی باولی سے نظر آوے ہے' تیری ماں بھی۔ تم اس کی آنکھوں کی طرف جھکے تو مجھے یاد آیا میں۔۔۔ اسٹوڈیو میں کھڑی ہوں۔

اور میں جل گئی نہ جانے کون سی فلم کا سیٹ تھا جس میں کھڑکیاں' دروازے ہی دروازے تھے۔ اب میری باری تھی تو یہ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک بنگلہ ہی بنا لیتے۔ اسی پیسے سے دنیا جہاں کے دروازے کھڑکیاں لگوالیں۔ ساری کوٹھی کے دروازے اس سیٹ پر لگا دیئے۔

تمہارا قصور نہیں۔۔۔ اللہ میاں نے عورتوں کا خانہ ہی ایسا کھلا چھوڑ دیا جتنی جس میں عقل ہو اتنی ہی تو بات کرے گی۔ کوئی بات نہیں یہ بچہ بھی نہ جانے کیا پیدا ہو گیا۔ کمال ہے تمہارا نام کیا ہے۔۔۔۔۔ بول بے۔۔ کیا نام ہے تیرا گلفام۔

آج تمہارا سوئم بھی ختم ہوا۔ اور میں اپنے پیروں کے قریب جھک جھک کر تمہارے قالینوں پر پڑے تازے تازے چاولوں کو جو گھبراہٹ میں، بہت سے منہ میں نہ جا سکے۔ گر گئے۔ انہیں اٹھا کر دسترخوان پر ڈال رہی ہوں کہ تمہارے قالین نہ گندے ہو جائیں۔

سوئم کے پلاؤ کے چاول۔ سلیقے سے سجایا ہوا کمرہ جسے میں نے پرسوں پہلی بار دیکھا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد تمہارے گھر کبھی نہیں آئی۔ آئی تو ایسے وقت جبکہ طاقت مہمان نہ داشت۔۔ منوں

مٹی میں یہ لوگ تم کو دبا آئے اب اگر تم نے لاکھ چیخ چیخ کر آوازیں بھی دی ہوں تو کون سنتا ہے۔
کیسی عجیب رسم ہے یہ بھی۔ تمہارے کمرے میں بیٹھے ہوئے تمہارے تینوں بھائی' ماں' خالہ' بھابھیاں' سب تمہارے پوشیدہ پر اسرار رازوں کو جاننا چاہتے ہیں۔ تمہاری کھلی ہوئی الماری میں تمہاری غزلوں کی بیاض سے' میں بھی تو اسی فکر میں کوئی ادھوری تحریر ڈھونڈنے کی فکر میں ہوں نہ جانے کب سے۔ تم نے تنہائی میں جب کبھی دنیا کے دکھاوے سے بے خبر ہو کر کبھی کوئی تحریر چمکیلی روشنی کے ساتھ' تمہارے قلم کی روشنائی میں شاید مل گئی ہو' تم نے نڈر ہو کر لکھ دی ہو کسی کے لئے۔ آگرے کی گائیکی کے لئے یا بمبئی کی نادرہ کے لئے۔ کراچی کی فلمی دنیا کی فردوس' تمہاری آخری ہیروئن۔ "ب" کے لئے کچھ تو لکھا ہو گا۔ مگر وہی سلیقے سے دکھاوے کے لئے غزلیں لکھی ہوئی ہیں کہیں جو ایک لفظ فالتو ہو۔۔
تمہارے لئے۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی خاموشی سے ان کی ضرورتیں پوری کرتے رہے۔ آج تمہاری الماری میں ۱۹۴۳ء کی غزلوں پر نظر پڑی۔ یہ وہی زمانہ تھا تمہارا۔ دلی تم نے ۱۹۴۲ء کے آخر میں آنا شروع کیا۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو سے آگرے والی انوربائی مرحومہ نے یہ غزل کئی دفعہ گائی۔

تم کو آخر میرے ان کے درمیان آنے سے کیا
محسن من وہ سمجھ جائیں گے سمجھانے سے کیا

حسن میں خود اعتمادی' عشق میں بے رہ روی
وہ اثر لیں گے مرے ناراض ہو جانے سے کیا

آپ اپنے رنگ میں ہیں میں ہوں اپنے رنگ میں
دل بہل ہی جائے گا اس طرح بہلانے سے کیا

اشتعال آمیز باتوں سے اگر ضد ہو گئی
ایسے سمجھانے سے حاصل' ایسے سمجھانے سے کیا

مجھ کو تو یہ شبِ نیازی بے رخی سب کچھ قبول
آپ کو راحت ملے گی میرے تڑپانے سے کیا

ان کا ملنا بھی غلط ترک تعلق بھی محال
یہ حیات کشمکش بھی کم ہے مر جانے سے کیا

مجھے ایسا لگا جیسے ابھی میرے ساتھ ، موتیا کے پھولوں کی بالیاں پہنے ہیرے کی کیل ناک میں پہنے تانپورے پہ سر رکھے آنکھیں بند کئے انوربائی نے ابھی ابھی یہ غزل ختم کی ہو۔ جیسے وہ آج میرے پاس تمہارے پرسے کے لئے آئی ہو۔

میں یہ سب لکھ رہی ہوں۔ نخشب تم میرے سامنے کھڑے ہو۔ بالکل اسی طرح۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں کیسے اپنے آپ کو اب سمجھاؤں۔ بڑی تکلیف ہے۔ اے کاش تم واپس آ جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ پرسوں کالی سفید چوکیوں کو جوڑ کر جب تمہیں لٹایا تھا ' میں نے پرسوں صبح تم کو اس حالت میں دیکھا ' نیچے برف کی سلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ساری زندگی تم نے ایسی ٹھنڈک پھیلا رکھی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے جسم کے چاروں طرف۔ سفید کفن میرے لئے کوئی نیا پن نہیں لئے ہوئے تھا۔ کفن نہ سہی ' تمہارا لباس ہی ایسا براق سا تھا سفید شیروانی۔ سفید ٹوپی۔ سفید پاجامہ۔ سفید جوتا۔ سفید موزے۔ مجھے لگا ایسے ہی لیٹے سو رہے ہو۔ تمہارے چہرے پر موت کی سختی بھی نہ تھی۔ لوگ کہتے تھے دنیا بھر کا حسن ہے۔ مگر مجھے لگا اداسی تھی۔ حسرت تھی ہونٹوں پر۔ جیسے موت نے فقرے توڑ لئے۔ پسماندگی تھی۔ ایسے لاچار سے تم مجھے کبھی نظر نہیں آئے۔ اور میں نے سارے ضبط توڑ دیئے۔ چوڑیوں کے شیشوں کے ننھے ننھے ٹکڑے آنکھوں سے چھنا چھن گرنے لگے۔ ٹھہرو۔ نہ جاؤ۔ وہ چیخ جو میں تم تک پہنچانا چاہتی تھی۔ روح کی پیاس سے چیخ گئی۔ خراشیں بکھر گئیں۔ تمہاری بہن نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ جیسے انہیں میرا انتظار تھا۔ ان کی آواز میں کارواں لٹنے کی خبر تھی۔ آنسوؤں سے بھیگے بال۔ ان کی گردن میں پھولی ہوئی رگوں کے ساتھ لپٹ گئے تھے۔ پورا ہال کھچا کھچ عورتوں سے بھرا ہوا۔ جو دو بڑے قد آدم آئینے تم نے لگا رکھے تھے اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے۔ ان میں چاروں طرف بہت سی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ' گلابی گلابی کانپتے ہونٹ ' سب تم کو پکار رہے تھے۔ تمہارے گھر پر پہنچنے کے لئے جب میں اوپر چڑھتی ہوئی آئی تو اتنے لوگ تھے جیسے مجھے لگا کہ تمہاری اس آخری فلم کا شوا تنارش لے رہا ہو۔ ساری سڑکیں ' سیڑھیاں ' کمرے ' پورا گھر ' سب جگہ سر ہی سر تھے۔ اتنے ڈھیر سے۔ اور یہ سارے سر ہی سر زینے پر سے گزرتے ہوئے سڑک پر پھیل گئے تھے۔ تمہاری فلم کے آخری شو

نے بڑا رش لیا۔ مگر اس وقت ہال میں، میں بالکل اکیلی بیٹھی ہوں۔ آؤ نا پردہ اٹھاؤ۔

کتاب والا

اتنے سارے تعزیتی خطوط میں سے آج عینی کے اس خط سے اُمڈا ہوا بند کھل گیا۔ "تم اپنے بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن ہو۔ مجھے خود سرخوش بھائی یاد ہیں۔ قصر شاعر میں جب ہم سب آیا کرتے تھے۔ اماں بی کتنا چاہتی تھیں۔ سرخوش بھائی کو۔ "چمنستان" دلی سے نکلتا تھا اس زمانے میں"۔

اور مجھے بھائی شبلی کی جوانی کی شکل یاد آ گئی۔ جب عینی اس زمانے میں اندر پرستھا کالج میں تھیں۔ اور میں دلی کی سبزی منڈی کے اسکول کوئن میری میں تھی۔ نویں کلاس کی طالبہ۔ اس زمانے میں سر رضا علی کا "اعمال نامہ" بھائی شبلی یعنی سرخوش بھائی چھاپ رہے تھے۔ رضا علی صاحب کی گاڑی صبح شام دروازے پر ہوتی تھی۔ عینی ہمارے گھر بیگم نقوی 'نذر سجاد کے ساتھ یعنی اپنی امی کے ساتھ مجلس میں جانے کے لئے آئیں اور سرخوش بھائی نے مجھے ملایا کہ "یہ ہیں عینی بی بی" اور یہ ہیں چندو "خدیجہ نقوی" اور "خالدہ نقوی" اور وہ سب لڑکیوں کو بالکل بچوں کی طرح آئسکریم کھلا رہے تھے۔ ہمارے گھر سے باہر یعنی قصر شاعر سے باہر گلی کے نکڑ پر۔ لب سڑک ہندوستانی پبلشر کا بورڈ لگا تھا۔ سرخوش بھائی نے چار کمروں کا مکان کرائے پر لیا تھا۔ جہاں سے چمنستان نکلتا تھا۔ اور اسی کو پبلشنگ ہاؤس بنایا گیا۔ جس میں اثر جلیلی اجمیر سے بلا کر نوکر رکھے گئے تھے۔ قریشی صاحب جو ایم اے کہلاتے تھے۔ اور دونوں ہمارے استاد بھی تھے۔ وہ اسی دفتر میں رہتے۔ ذاکر اور میر فغان صاحب دوسرے کاموں کے لئے تھے۔ اثر صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے۔ یہ سب گھر میں سب کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اور امی کے بیٹوں کی فہرست میں ان کے نام
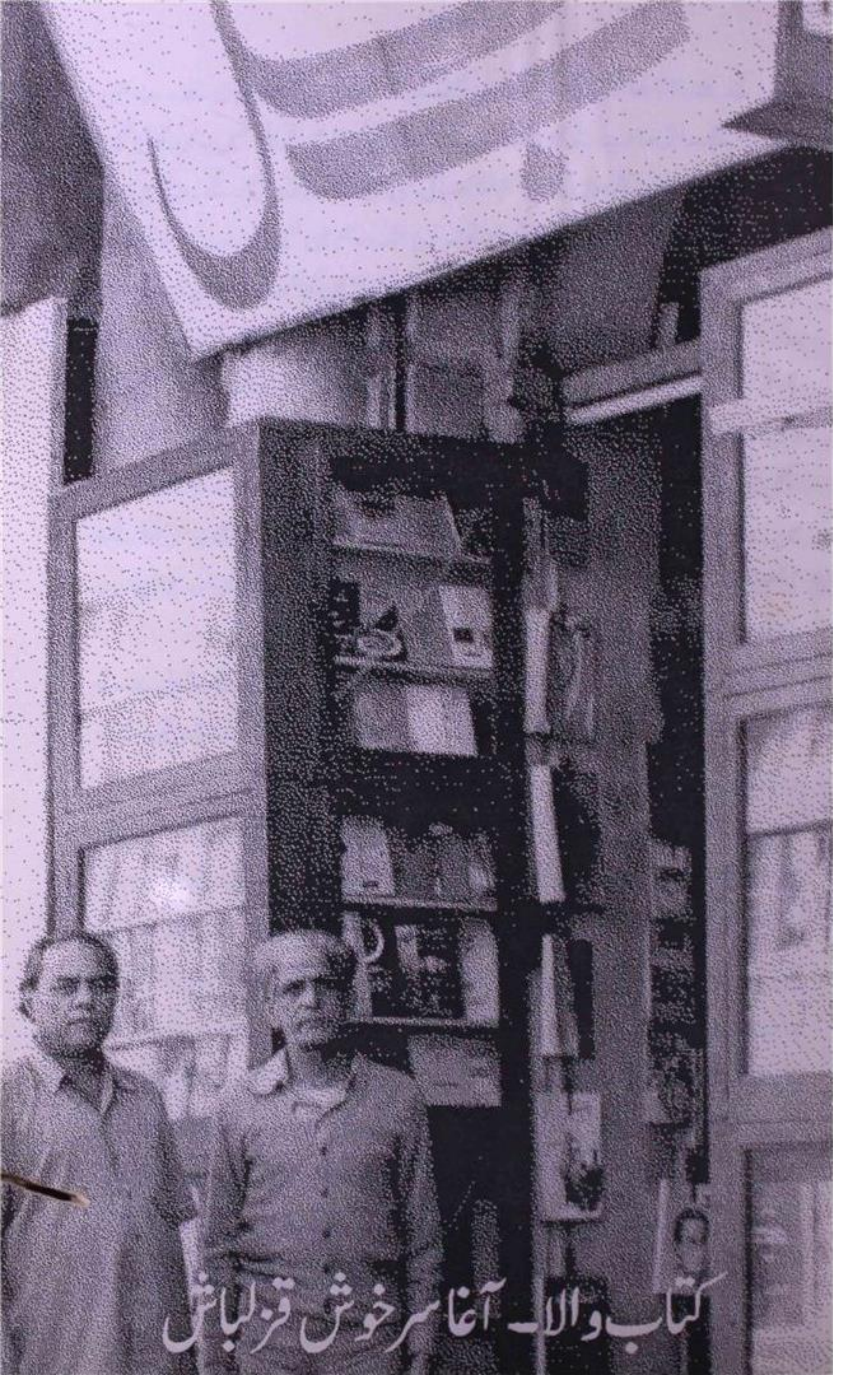
کتاب والا۔ آغا سرخوش قزلباش

بھی آگئے تھے۔ اثر صاحب مجھے سچ مچ بہن سمجھتے تھے۔ مرنجاں مرنج دھان پان سے۔ بے ضرر سے شاعر تھے۔ اثر صاحب نے جس محنت سے مجھے گرامر کی گردانیں کرائی تھیں۔ اور کوئی نہیں کراسکتا تھا۔ میں ہی جانتی ہوں۔ میں اکثر خفا ہو جاتی تھی ان سے ہر وقت پیچھے لگے رہتے ہیں۔ یہ بھی بھائی صاحب کی طرح ہیں۔ ابھی تو پڑھا تھا۔ آج جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں۔ نہ سرخوش بھائی ہیں نہ اثر صاحب۔ نہ اماں۔ اثر صاحب کبھی کبھی دھیمی آواز میں کہا کرتے تھے بہن آپ کی بہت سے عادتیں سرخوش بھائی سے ملتی ہیں۔ اور میں جل جاتی۔ چپکے سے کہتی خدا نہ کرے۔ میری ان کی کیوں عادت ملتی۔ اماں کہا کرتی تھیں۔ تم دونوں آغا صاحب پر گئے ہو۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ اور ہم دونوں کہتے جی نہیں۔ اور میں چپکے سے کہتی خدا نہ کرے میں ان پر ہوتی۔ جب بھی کبھی میں سرخوش بھائی سے بحث کرتی ادھر سے جواب آتا۔ میں تمہارا بڑا ہوں۔ تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کیجئے۔ اور میں فوراً اس لڑکی کو بلا لاتی۔ جو سر پر دوپٹہ اوڑھے۔ سر جھکائے۔ آنکھیں نیچی کئے کھڑی رہتی۔ جس کو وہ چاہتے تھے۔ میرے بھائیوں اور بھابیوں اور میری ماں کو ہمیشہ ہی وہ لڑکی پیاری رہی۔ جو مجھ سے تقریباً کھوتی جارہی تھی۔

پاکستان کراچی میں اکثر اتوار کو دونوں بھائی کھانے پر اماں کے ساتھ بیٹھے ہوتے۔ تو دلی سے لے کر۔ جھالاواڑ۔ حیدر آباد دکن' کلکتہ' بوندی' گوالیار' جے پور اور لاہور کے ایسے قصے سناتے رہتے۔ اور بھول جاتے کہ میں اور ان کی بنائی ہوئی درجن بھر اولادیں بھی دسترخوان پر چاروں طرف موجود ہیں۔ اماں کا جھریوں بھرا چہرہ۔ سرخ و سفید ریشم جیسی کھال میں ابھر آتا۔ نیلی چمکدار آنکھیں' روشنی سے پھیلنے لگتیں۔ اور وہ ان دونوں بیٹوں کے ساتھ ان سڑکوں پر مکانوں میں محلے والوں کے ساتھ پھرتی رہتیں۔ سیتاپور کے قصیارہ اور بنگلے کے قصے۔ اپنے بھائیوں کے قصے۔ جو ہندوستان میں ایسے کھوئے۔ کہ ان کی بہن ساری عمر نہ دیکھ سکی۔ پھر اماں۔ اور بھائی صاحب۔ سرخوش بھائی۔ سب بھول جاتے اور تینوں دوستوں کی طرح مذاق کرتے۔ ہر محلے والے کے اماں نے نام رکھے ہوئے تھے۔ ہر آنے جانے والے کو خطابات سے نوازا کرتی تھیں۔ ایک شاعر تھے جنکی بہت موٹی آواز تھی اور وہ ریڈیو پر نوکر تھے۔ اور جب وہ آکر دروازے پر آواز دیتے تھے۔ آغا صاحب۔ تو اماں کہتی تھیں۔ "لو منکاف ہاؤس" آگئے۔ اور اپنے ساتھ کمبل بھی لائے ہیں۔ اب نہ جائیں گے اور بھائی شیلی ہنستے جاتے تھے۔ اماں وہ صوفی صاحب آپ کے کھٹ کھٹ' ملے تھے۔ ارے بھئی توبہ کرو۔ اماں گرم روٹی ان کی پلیٹ میں ڈالتی جاتیں۔ اور

شیرو وہ بڑے خمیرے اور ڈاک کے ڈبے بھی تو آئے تھے۔ تمہیں پوچھ رہے تھے۔ کتنے لمبے ہیں ایسا لگتا تھا کہ اب کے چلے تو کمر کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اور پھر کہاں سے باتوں کا قافلہ مڑتا جاتا۔ شیرو یاد ہے۔ جھلاواڑ کے مہاراج بھوانی سنگھ کیسے اقبال کو گود میں لے کر آئے تھے۔ جب آغا صاحب کو اسٹیج پر چاقو مارا تھا۔ ہیملٹ ڈرامے میں۔ تو اقبال بھائی کی موت پر تینوں کی آنکھیں بھر آتیں۔ اماں کو پانی کی ضرورت پڑ جاتی۔ گلا روندھ جاتا۔ سب سے چھوٹا بیٹا اور پہلی موت تھی۔ یہ تینوں دوست پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔ بقول اماں کے۔ آفتاب بھائی سے دوستی تھی۔ اماں کی بارہ سال عمر تھی جب آفتاب بھائی پیدا ہوئے تھے۔ بھائی شیلی کو وہ منجھلے کے بجائے بڑا بیٹا سمجھتی تھیں۔ جہاں تک میں سوچتی ہوں اقبال بھائی کو سب سے چھوٹا بیٹا۔ میں تو کسی گنتی ہی میں نہ تھی۔ مجھ کو سنا ہے میرے باپ بہت چاہتے تھے۔ اماں تینوں بیٹوں کو بہت چاہتی تھیں۔ بقول اماں کے میرے بچوں میں تین چار سال کا فرق ہے۔

بھائی شیلی یعنی آغا سرخوش قزلباش۔ بابا کے انتقال کے بعد نہ جانے کب ایک کھنڈرے لڑکے سے بچھڑ کر آہستہ آہستہ بڑے بیٹے کی جگہ لے رہے تھے کم سے کم میں تو یہی سوچتی تھی۔ بھائی صاحب کے دوست یونس واسطی، محبوب گوردھن داس اگروال جو بھائی صاحب کے بہت دوست تھے۔ قصر شاعر میں اکثر آتے رہتے۔ مگر بھائی سرخوش کے دوست اور ان کا بستر بھی دفتر ہی میں رہتا۔ گویا وہ شاعر ادیبوں کا ریسٹ ہاؤس تھا۔ وہ امی کو پرچہ مجھے روپوں کے ساتھ بھیجتے۔ بیٹا جی تانا۔ ہمیشہ تانا لکھتے تھے۔ آج رات کو دس پندرہ آدمی آئیں گے۔ مشاعرے پر سے واپسی پر کھانا پکوا کر نظیر کو بٹھا دیں۔ وہ گرم کر دے گا۔ اور ہم کھالیں گے۔ امی کو جاگنے کی ضرورت نہیں۔ اور ہوتا یہ تھا کہ میرے کمرے میں جب اماں آدھی رات کو آتیں تو میں سمجھ جاتی کہ بہت لوگ آگئے ہیں۔ جو اماں کا بستر بھی گیا۔ مہمان خانے میں اور میں جل جاتی۔ اگر مجاز آگئے تو صبح ہی صبح ایک بستر سوکھنے کے لئے جائے گا۔ اور ضائع ہو جائے گا۔ امی سے چھپا کر بھائی صاحب؟ بھائی شیلی کئی دفعہ خود اوپر بستر بچھا کر آتے۔ چادریں فیکٹری کو بھیج دی جاتیں دھلنے کے لئے اور نظیر اور میر صاحب فغان چار بجے نہاری لا رہے ہوں گے۔ اور دس گیارہ بجے تک نیچے کا کمرہ بند رہے گا۔ میری عمر کے دس بارہ سال دلی کے گھر میں جسے شاعروں کا اڈا کہا کرتی۔ ایسے ہی گزر گئے۔ مہمان داری میں۔ ہاں عصمت آپا۔ شاہد بھائی۔ تسنیم سلیم چھتاری سے ملاقات ضرور کروائی سرخوش بھائی نے۔ جس سے مجھے واقعی خوشی ہوئی۔ باقی تو بقول فیض صاحب کے۔ "ایویں ایں" ہوتے

ہیں۔ فیض صاحب اور مجاز۔ جوش صاحب جگر صاحب فراق صاحب۔ عرش ملسیانی۔ وغیرہ جب بھی آئے تو میں مہمان خانے میں ضرور بلائی جاتی۔ اور میں دل سے بھی خود چاہتی تھی ان سے ملنا۔ بھائی شیلی کہتے آجاؤ۔ تمہیں سب پوچھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں ٹال بھی جاتی۔ شاعروں سے مجھے چڑ ہو گئی تھی۔ ذرا کسی نے کہا اور شاعر حضرات سنانے بیٹھ گئے۔ ہمارے گھر کا لڑکا نظیر بڑی بی کا آٹھواں لڑکا تھا۔ کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے۔ بڑی بی نے میرے مانگنے پر نظیر ہمیں تحفتاً دیا تھا۔ اتنا چھوٹا سا تھا مگر تھا بڑا ذہین۔ بھائی شیلی نے اسے پتہ نہیں کیسے سکھا دیا۔ کس وقت سکھایا۔ نہیں معلوم۔ ذرا کہتے ہاں بیٹا ذرا سناؤ۔ جگر صاحب کیسے پڑھتے ہیں۔ تو وہ ایک دم ان کے شعر طرز میں پڑھنے لگتا۔ نازاں، گوہر بھائی، خمار، نخشب اور صابر کو لڑا دیتے۔ جو مستقل ہمارے دفتر ہی میں تقریباً رہتے تھے۔ ہاں۔ بے نظیر! سنائیو تو صابر کیسے پڑھتے ہیں۔ وہ نخشب کی آواز بنا کر نظیر سے کہتے۔ اور وہ شروع ہو جاتا۔ پھر ایک شور اٹھتا۔ اور نظیر بھاگا ہوا اندر آجاتا۔ چھوٹے آغا صاحب نے مجھ سے نخشب صاحب کے شعر سنانے کو کہا تھا۔ وہ مجھے مارنے دوڑے ہیں۔ میں تو اب کمرے میں نہیں جاؤں گا وہ اپنی توتلی آواز میں بتاتا۔ جگر صاحب سب شاعروں کی نقلیں سنتے پھر پیسے بھی دیتے۔

نہ جانے چمنستان سے پیسہ آتا تھا یا نگارستان سے ایجنسی جو کتابوں کی دکان جامع مسجد پر تھی۔ جس میں صوفی وارث اور اثر صاحب بھی بیٹھتے تھے۔ ہم کو تو جب دہی بڑے کھانے ہوئے اپنی سہیلیوں کے ساتھ دکان پر چلے جاتے اور سرخوش بھائی سے مفت میں قلفی اور دہی بڑے کھا کر آجاتے۔ کبھی خیال ہی نہیں آتا۔ یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ یا کوئی مجبوری اس میں حائل ہو سکتی ہے۔ بھائی شیلی، کبھی سنتے کہ حیدر آباد جا رہے ہیں۔ کبھی سنتے گوردھن داس بھائی کے ساتھ جا رہے ہیں بمبئی میں۔ کاغذ بہت مہنگا ہے دلی میں۔ وہاں سے لائیں گے۔ حیدر آباد میں مشاعرہ بھی ہے۔ پوری شاعروں کی کھیپ جا رہی ہے۔ واپسی پر بابا کی طرح میں ان کے بکس کا انتظار کرتی۔ نجانے کیا کیا لائیں گے اب کے میرے لئے۔ مجھے بابا کی شکل یاد نہیں مگر چیزیں ملنے کی خوشی یاد ہے۔ اب تک۔ اور بابا کے بکس میں سے جب مٹی کی خوبصورت سی گجریاں نکلتیں دھوبن سفید سی کپڑوں کی گٹھری لئے نکلتی اور سبزی والی، پھل والی اور بہت سے کھلونوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ اب بھی جب میں ہندوستان جاتی ہوں تو امپوریم میں سب چیزیں رکھی دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے باپ یاد آجاتے ہیں جو یہ سب۔ اماں کہتیں کہ تمہارے بابا گوالیار سے لائے تھے۔ بھائی شیلی

حیدر آباد کی چوڑیوں کے بکس بھر لاتے تھے میرے لئے۔ آج صبح عینی کے خط سے ابھرتا ہوا میرا کمرہ جو دلی میں تھا۔ اس میں وہ چوڑیوں کی الماری بھی نظر آئی جس میں کچھ چوڑیوں کو تو ہاتھ بھی نہیں لگا تھا۔ بھری بھرائی۔ میری چیزیں۔ سب کھو گئیں۔ اب کے جب میں ہندوستان گئی۔ تو مجھے کمرہ تو کمرہ۔ گھر میں بھی جانے کی اجازت نہ ملی۔ عینی مڑ مڑ دیکھتی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ میں کس سے شکایت کروں۔

اس دفعہ لندن میں میری اور بھائی شیلی کی لڑائی بھی نہ ہوئی۔ اگر بحث بھی ہوتی تو بھی وہ طرح دے ڈالتے۔ کبھی میں چپکی ہو کر کھانا پکانے کے بہانے ان کے پاس سے اٹھ جاتی۔ بھائی صاحب کے خط کی تحریریں میرے پیچھے دوڑتی رہتیں۔ وہ بیمار ہیں۔ ان سے کچھ نہ کہنا۔ ان سے خفا نہ ہونا۔ صبح پانچ بجے انہیں چائے لا کر دیتی تو وہ اس طرح شال اوڑھے۔ سگار سلگائے۔ میری کتابوں کو دیکھ رہے ہوتے۔ تم کو اتنی تکلیف دیتا ہوں۔ نیچے سے اوپر تمہارے کتنے پھیرے ہو جاتے ہیں۔ بیٹا جی میرے ساتھ چلو۔ بس اب نہیں دیکھی جاتی تمہاری حالت بہت کام کرتی ہو یقیناً۔ پھر رونے لگتے۔ تم میں اماں کی جھلک اب بہت آنے لگی ہے۔ پھر اماں کا ذکر کرتے' روتے۔ ایک دن کہنے لگے۔ جب سے یہاں آیا ہوں کتنی عجیب بات ہے۔ ہمیشہ کراچی اچھا لگا۔ اور کوئی شہر جچا ہی نہیں۔ مگر اماں کے بعد۔ ایسا جی چاہتا ہے۔ اماں پھر سے جی اٹھیں۔ ان کو پھر سے دلی والے گھر لے جائیں۔ جس کے لئے وہ ترستی رہیں۔ اور بھائی صاحب کو بھی۔ اور ہم لوگ پھر سے اسی طرح رہنے لگیں۔ جیسے اتنے سال کسی چیز میں آلودہ ہی نہ ہوئے ہوں اپنے پرانے گھر میں پھر سے رہیں۔ دوستوں کو پوچھتے رہے۔ خمار کہاں ہیں تم ملی تھیں۔ جذبی کیسے ہیں۔ کیفی کنور صاحب (مہندر سنگھ) کیسے پیارے ہیں۔ گوہر بھائی اور ہم۔ کے بچوں سے ملیں۔ پھر سب کو پوچھتے رہے۔ دھرم پال؟ ـــــ ان کا انتقال ہو گیا.... ارے! ان للہ... 'پھر رک گئے میں نے ٹیپ کا بند پیش کیا۔ جو وہ مجھ سے کبھی نہ پوچھتے۔

ارے بھائی! شیلی! "پشپا" ویسی نہیں رہیں بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور چاچا جی بھی بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ میں ایک رات ان کے گھر رہی۔ چاچا جی مجھے عینی کے گھر تک او کھلے' چھوڑنے گئے تھے۔ تم اتنی دور اکیلی نہیں جاؤ گی۔ کہتے تھے مجھے آپ یاد آ گئے وہاں بھی ـــ میری گودوں میں پلا ہوا اسد اور آپ لڑتے ہیں۔ کہ تم کو گاڑی میں بٹھا کر چھوڑ آئے گا۔ اتنی دور اکیلے نہیں جاؤ گی۔ آپ سب کو ابھی تک میں وہی چھوٹی لڑکی نظر آتی ہوں۔

تمہاری تو الٹی کھوپڑی ہے۔ چاچاجی کو میں نے سکھا کر بھیجا تھا وہاں۔ جو تم کو کشمیری گیٹ سے اوکھلے چھوڑنے گئے۔ ابھی اس دنیا میں کچھ شریف لوگ زندہ ہیں۔ پھر وہ چپ ہو گئے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔ ان کو پشپا دروازے میں کھڑی نظر آئی ہو گی جب پہلے دن وہ کرائے داروں سے ملنے گئے تھے۔ تو مجھے پشپا نے بتایا "وہ" ان کو کنول کہتی تھی۔ کنول بمبئی چلے گئے کنول کب آئیں گے؟۔۔۔ اور پشپا ہی نے مجھے زبردستی عربی کے اسکول سے اٹھوا کر اپنے کوئن میری اسکول میں داخل کرایا تھا۔ اس نے ہی میرے ریڈیو کے پیسوں کا حساب لگا کر فیس اور بس کا کرایہ نکالنے کا گر بتایا تھا۔ انگریزی پڑھانے اکثر وہ اوپر سے میرے گھر بھی آجاتی تھی۔ اور میں اس وقت بھی سوچتی تھی اور اب بھی سرلا گپتا' موہن' ایرا موترا' رانی' ستیا سگندھ' سب ہندو عورتیں پڑھی لکھی' سادی اور صاف ستھری کیوں ہوتی ہیں۔ ہر چیز کی خاموشی سے پرستش کرنا ہی ان کا حسن ان کے پیار کرنے کے طریقے ہی پھولوں جیسے کومل ہوتے ہیں۔ اور یہ میں اس روز دلی میں پشپا کے پلنگ کے پاس لیٹی سوچ رہی تھی۔ اس کی بیٹی بیاہی جا چکی ہے۔ بیٹا بھی بڑی پیاری آنکھوں والا ہے۔ مجھے چھوڑنے بس تک آیا تھا۔ یہ سب میں لندن میں بھائی شیلی کو ایسے بتا رہی تھی۔ جیسے عینی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ پشپا کی روتی آنکھوں کی تصویریں میں کیوں ان کو اتارنے دیتی۔ وہ ان کی بیماری کا سن کے کیسے بے چین ہو گئی تھی۔ مجھے عام عورتوں کی طرح وہ بھی بے وقوف لگی۔ بھلا دل کی بیماری سے اس کی اپنی چاہت کا کیا رشتہ۔ میں نے عقل کی راہ اسے دکھائی۔ وہ تو ہڈیوں میں جب بخار ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے ان کو یہ تکلیف شروع ہوئی۔ سرخوش بھائی کے مٹیالے چہرے پر زردی روشنی جو پھیلنی شروع ہوئی تھی۔ وہ میں نے یہ کہہ کر مٹا دی۔ حفیظ ہشیار پوری اندر سے بڑے حسین شاعر تھے ان کا یہ شعر ہمیشہ جادو کی طرح چڑھا نظر آتا ہے۔

اب تو پہلی ہی ملاقات میں ہر صورت پر
کسی دیکھی ہوئی صورت کا گماں ہوتا ہے

ہاں بہت اچھے شاعر تھے غزل کے۔ وہ کھڑکی سے باہر بارش میں لمبی نیلی سڑک دیکھ رہے تھے۔ چپ چاپ نکل کر چلے گئے تھے۔ بہت دور چلے گئے تھے۔

اور اسی روز مونا کی شکل کراچی میں جب میں نے بوہری بازار کے فلیٹ کے برآمدے میں سے پہلے بار جھانکتے ہوئے دیکھی۔ تو بڑی حیران ہوئی۔ اللہ میاں کا کمال۔ چلو پشپا بیگم مسلمان لڑکی کے روپ میں حاضر۔ اللہ میاں نے مہاجروں کی بھی سن لی۔ اور پھر میں بھی اپنے چھنے ہوئے نقوش۔ رنگ روپ۔ نئے ملک نئے شہر میں آوازوں کے جنگلوں میں ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ تلاش معاش اس گنجلک اجنبی شہر میں مشکل تھی۔ شہر کی سڑکیں ویرانی اوڑھے ہوئے اجنبی چہروں کو سمیٹے لئے جا رہی تھیں۔ اب کے تو بھائیوں کے اپنے کھانے پینے کے لالے تھے۔ کجا پانچ چھ لوگ جو اماں جہاز میں اپنے ساتھ لائی تھیں۔ میر صاحب۔ نظیر۔ اثر جلیلی۔ وہ سب بوہری بازار کے دو کمروں کے فلیٹ میں کیسے سمائیں گے۔ اماں کی ضدیں۔ ان کے بیٹے ہمیشہ ہی اٹھاتے رہے۔ چھ ہزار شبلی بھائی اپنے ساتھ لائے تھے جو کہ اللہ میاں نے ان کی قسمت میں لکھ دیئے تھے۔ دفتر۔ دکان۔ گھر سب کے بدلے چھ ہزار لا سکے۔ ہندوستانی پبلشر کے دفتر میں۔ دو کمرے تو کاغذوں کے رموں سے بھرے چھوڑ کر آئے تھے اس زمانے میں کرفیو کے دو مہینے میں اس دفتر میں اماں اتنا راشن چھوڑ کر آئی تھیں کہ یہ پانچ چھ لوگ گھر سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ اور وہ راشن ان سب کے لئے پورا ہوا امی نے کراچی پہنچتے ہی بھائی صاحب کے لئے اور اپنے گھر کے لئے رونا شروع کر دیا تھا۔ بھائی شبلی کی ول پاور تھی جو شکستہ دل کو چھپائے رہے اور چھ ہزار پینتیس ہزار کیپیٹل۔ سینما کے پارسی کو کتاب محل کی پگڑی دے کر جس میں نعمان بھائی اور ممتاز حسن صاحب کی مدد نے پینتیس (۳۵) ہزار شامل کر دیئے تھے۔ جو پگڑی کی صورت میں اس پارسی کو دیئے گئے۔ اور کتاب محل ایلفنسٹن اسٹریٹ پر نمودار ہوئی۔ یہ سب کیسے ہوا۔ کیونکر ہوا! کیسے بھائی صاحب آئے! قرضہ کیسے ادا ہوتا رہا؟۔ اماں کو کیسے سنبھالا؟۔۔۔ یہ سب کام انہی اکیلے سرخوش بھائی کا تھا۔ سب کے بعد میں دلی سے اقبال بھائی آئے۔ میں بھی ان ہی کی بہن تھی۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھنا مجھ کو بھی نہیں آتا تھا۔ لاہور سے فرید صاحب کو فون کیا۔ جو اس زمانے میں ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ اور مجھے لاہور میں نوکری مل گئی۔ آل انڈیا ریڈیو کی خوبصورت عمارت چھوڑنے کے بعد۔ انٹیلیجنس اسکول کے خیموں کے اسٹوڈیوز میں ایک دو مہینے بغیر تنخواہ کے کام کرنے کے بعد۔ مجھے بڑی شدت سے پیسے چاہئیں تھے۔ اپنے پیسے۔ اور میں اماں کو لے کر لاہور چلی گئی۔ بھائی شبلی کو اکیلے چھوڑ کر۔۔۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کو پکار کر کون دے گا۔ سدا کی خود غرض جو ٹھہری۔

انگ شکستہ، دل ہے شکستہ پر بھی شکستہ مستی میں
حال کسو کا اپنا سا، اس میخانے میں خراب نہیں

کیسا منحوس مہینہ ہے یہ میرے لئے۔ اور لوگ کہتے ہیں۔ دنوں مہینوں سے کیا ہوتا ہے۔ اب کے یہ جون ایسا آیا۔ جس کی تیس تاریخ۔ ساری عمر مجھے ہی کیا سارے خاندان کو یاد رہے گی۔

آغا شاعر کے خاندان میں اب سوائے بڑے لڑکے آغا آفتاب اور سب سے چھوٹی لڑکی سحاب کے اور کوئی اولاد باقی نہیں رہی۔ آغا شاعر کا سب سے مشہور معروف منجھلا لڑکا جس نے اپنے باپ کا نام ہمیشہ ہی روشن رکھا۔ ہندوستان میں "چمنستان" اور پاکستان میں "نورنگ" ادبی رسالہ نکالا۔ ادبی کتابوں کی دکان۔ ہندوستان میں جامع مسجد پر "نگارستان" ایجنسی اور نکلسن روڈ کشمیری گیٹ پر۔ ہندوستانی پبلشر کا دفتر اور قصر شاعر چھوڑا۔ پاکستان میں الفنسٹن اسٹریٹ پر ادبی کتابوں کی دکان کتاب محل۔ یہی ہمارے اس خاندان کی پہچان تھی۔ پینتیس چالیس سال تک ادبی کتابوں کی منتخب یہی ایک دکان تھی۔ جس کے مالک تھے۔ آغا سرخوش قزلباش۔ جو تیس جون کو چلے گئے۔

لندن، امریکہ اور یورپ سے آنے جانے والے اسی دکان سے ادبی کتابیں خریدتے۔ مگر چالیس سال سے اس دکان کے مالک نے کوٹھی تو کجا ایک مکان بھی نہیں خریدا۔ کار کا تو سوال ہی کیا۔ بوہری بازار کے دو کمروں کے فلیٹ میں ان کی تینوں لڑکیاں اور ایک لڑکا اسی میں جوان ہوئے۔ وہ صرف ایک لڑکی کی شادی کر سکے۔ پینتیس ہزار (۳۵۰۰۰) قرضہ لے کر جو کتاب محل لی تھی۔ وہ اسی بے دردی سے چھین لی گئی۔ جس کا صدمہ ان کو بھی لے گیا۔ اور ان کی ماں کو بھی پیرالائز کر گیا۔ اور ایک سال میں ماں بیٹے دونوں اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ کسی سے انہوں نے کچھ نہ کہا۔ جیسے چلتے چلتے رک گئے تھے۔ سمجھ گئے تھے۔ اپنے سارے کام سمیٹنا چاہتے تھے۔ مگر چپ چاپ برآمدے میں ٹہلتے رہتے آسمان پر نظر گاڑے۔ میری اور ان کی ماں نے بھی اپنے اپنے آنسو پی لئے۔ اپنے چھوٹے بیٹے کی موت کے بعد۔ اپنے منجھلے بیٹے کی دکان چھننے کا غم وہ برداشت نہ کر سکیں۔ بقول ان کے اب دال روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔

چھوٹے بیٹے اور دکان کا غم نہ سہہ سکیں اور فالج کی اوٹ میں زبان اور ذہن پر تالے لگا بیٹھیں۔

تین سال پلنگ سے لگ گئیں۔ بیٹوں نے اتنا چاہا تھا ان کو۔ وہ بھی ہر بچے کی تکلیف سے گھبرا جاتیں۔ اپنے منجھلے بیٹے کی دکان اور ان کے بچوں کے رزق کے لئے دن رات نمازیں پڑھتیں۔ آخر کار بستر سے لگ گئیں۔ پھر ایک روز خاموشی سے چلی گئیں۔ وہ بچہ جو ماں کی شکایتوں سے چھپ جاتا تھا۔ گھر کے کونوں میں وہ گھبرا کر ماں کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ بچے تھے میرے منجھلے بھائی آغا سرخوش جن کو میں بھائی شیلی کہا کرتی تھی۔ جو میرے استاد بھی تھے۔ ایسے استاد۔ جنہوں نے کبھی تعریف نہیں کی۔ میرے دوست بھی تھے۔ ایسے جس میں وہ چھوٹائی بڑائی کا رتبہ ہمیشہ ہی روشن رکھتے۔ ذرا سے بحث مباحثے میں۔ میں نڈر بن کر بولی۔ اور ادھر سے آواز آتی بے ہودہ باتیں مت کرو۔ کیا بکواس کرتی ہو۔ تمہاری تو الٹی کھوپڑی ہے سدا کی۔ اور پھر میں طنابیں کھینچ لیتی۔ بول چال بند ہو جاتی۔ جلد ہی من جاتے۔ کسی نہ کسی سے گھر میں خفا ضرور رہتے۔ جب چھوٹی تھی تو پرچے پر لکھ کر معافی مانگ لیا کرتی اگر میری غلطی ہوتی۔ اور سب کے سامنے آکر کہتے کہ میں نے معاف کیا۔ جب بھی کوئی چیز لکھی۔ سنانا چاہی۔ تو بے زاری سے ٹال دیتے۔ کبھی کبھی تو بچوں کو سکھا دیا کرتے کہ جب تمہاری پھوپھی کچھ پڑھیں تو آں۔ آں۔ آں۔۔۔۔ شور مچانا شروع کر دینا تم لوگ۔ کئی کئی دن نہیں ملتے۔ مگر میں چاہتی اگر یہ سن لیں تو ٹھیک بتا دیں گے جھوٹی تعریف تو نہیں کریں گے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ یہ خود مجھ سے آکر کئی دفعہ کہے۔ تب میری چیزیں دیکھتے تھے۔ دلی میں جب "چمنستان" نکلتا تھا۔ تو میرے کمرے میں آکر میری کاپیوں میں سے میرے افسانے پھاڑ کر لے جاتے اور "چمنستان" میں عنوان بدلا ہوا۔ انجام بدلا ہوا نظر آتا اور میں جل کر خاک ہو جاتی۔ کئی دفعہ تو میں اپنا افسانہ لکھ کر اس کے نیچے نوٹ لکھ دیتی۔ مہربانی سے اگر آپ افسانہ لیں تو جیسا ہے ویسا ہی چھپے گا ورنہ۔۔۔ آپ زحمت نہ کریں۔ مثلاً فلاں بھائی۔ فلاں باجی اپنے کمروں میں چلے گئے۔ قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں اور میں باہر سردی میں کھڑی سب سن رہی تھی۔ فلاں باجی فلاں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ مجھے لکھا ہوا ملتا۔ شریف بچیاں ایسے افسانے نہیں لکھتیں۔ اور میں لکھتی۔ مہربانی سے میری چیزیں نہ پڑھیں چھپیں گی تو بالکل ایسے ہی ورنہ نہیں۔ ایک دن ساڑھے تین سو روپے لے کر آئے۔ یہ لو تمہارے افسانوں کی کتاب چھاپ دیتا ہوں۔ کیا نام رکھو گی "بدلیاں"۔۔۔ بدلیاں

بکواس ہے۔ یہ بھی کوئی نام ہے۔

"واپس لے لیں اپنے پیسے"۔

اور پھر "بدلیاں" چھپی جس میں نیاز فتحپوری کا دیباچہ بھی تھا۔ شکر ہوا کہ بٹوارا ہو گیا ان کتابوں کا کیا حشر ہوا۔ ان کی صرف ایک کاپی تھی۔ لاکھ میں مانگتی تھی۔ مگر نہیں دیتے تھے۔ بے ہودہ چیز ہے کیا کرو گی پڑھ کر۔ ضدی بھی بہت تھے۔ اپنی ماں کی طرح۔ میں ان سے اکثر کہتی۔ باپ کی طرح وقت پر کھانا کھاتے۔ اگر تھوڑی دیر بھی ہو جائے تو ہرگز نہیں کھاتے۔ عجیب عادتیں تھیں۔ ویسے کھانے کو روٹی چٹنی ہی دے دو مگر بارہ بجے تک۔ ورنہ بھوک ہڑتال کام میں آتی۔ مجھے تو دونوں بھائی بہت چاہتے۔ مگر دونوں کی چاہتوں کے پلڑے ایک جیسے مگر ردعمل بہت مختلف۔ بچپن سے ہم نے دیکھا بھائی صاحب نے سب کے سنبھالنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ گھر کا بڑا لڑکا میں ہوں۔ اور وہی احساس اب تک صرف ان کے ہاں ویسے ہی تازہ بہ تازہ، شگفتہ ان کے پاس رہ گیا۔ تن من دھن سے ہمیشہ ہی انہوں نے سب کو پالا۔ بھائی شبلی نے تن من چھپا کر دھن ہی دیا سب کو۔ ماں کی خدمت میں بقول لوگوں کے انہوں نے جنت میں گھر بنا لیا۔ اور بھائی صاحب نے تین سال تک ان کی نرس بن کر خدمت کی دن رات۔ سرخوش بھائی۔ چمنستان کے ایڈیٹر کب بنے یہ کچھ یاد نہیں۔ ہندوستانی پبلشر کا بورڈ۔ قصر شاعر کے باہر۔ گلی کے نکڑ پر چار کمروں کے باہر والے فلیٹ پر جب لگایا گیا۔ تو معلوم ہوا کے اب مردانہ اور زنانہ الگ ہو گیا۔ کتابیں چھپیں گی۔ رسالہ وہاں سے نکلے گا۔ شاعر حضرات کی مہمان داری اب اس گھر میں ہو گی۔ ہمارا گھر اب خالی ہو گیا جس کی مجھے بڑی خوشی تھی۔ شکر ہے گھر صاف ہوا مہمانوں سے اونچی آواز سے مت بولو ادھر مت جاؤ شاعر حضرات دوپہر کے ۱۲ بجے تک سوتے رہتے تھے۔ اور ایک دن علی الصباح وہ ماں جو ہم سب کے سروں پر سایہ رحمت تھی۔ اللہ کو پیاری ہو گئی اور سرخوش بھائی آوازیں دیتے رہے۔ ان کی جدائی ان سے گوارا نہ ہوئی اور وہ بھی چند دن بعد دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خفا ہو کر حسب عادت کہیں الگ جا سوئے۔ ہم سب سے روٹھ کے۔

لندن میں ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ کونٹری چلو گی۔ چلو تمہاری سیر ہو جائے گی۔ قسمت خراب تھی۔ میں نے سوچا اکیلے ڈرتے ہیں جاتے ہوئے۔ بیماری کی وجہ سے۔ مان گئی۔ یہ کئی سال پرانی بات ہے۔ جب ممتاز حسن صاحب زندہ تھے۔ اس دن اندازہ ہوا کہ وہ شخص کتنا قیمتی ہے مگر افسوس ہم نے ان کی کوئی قدر نہیں کی۔ نہ ہماری گورنمنٹ نے کوئی فائدہ اٹھایا۔ کئی دفعہ فیض صاحب سے کہا۔ بڑے افسروں سے کہلوایا کہ وہ اگر لندن میں رہیں۔ تھوڑے سے پیسوں میں گورنمنٹ نوکر رکھ لے۔ تو اس حالت میں بھی وہ تیار تھے کام کرنے کے لئے۔ ان کی دور س

نگاہیں ایک سیکنڈ میں کتابیں کھینچ لاتیں۔ مجھ سے کہا کہ غدر کے وقت کے سن کی کتابیں دیکھو اور رکھ لو۔ میں اوپر سے ہو کر آتا ہوں۔ تم کو یہ کام آجائے تو تم ہی کرو۔ اپنے ملک کو فائدہ ہو گا۔ یہاں بڑی کتابیں ہیں۔ دیمک لگ جائے گی تباہ ہو جائیں گی۔ میں نے چار دفعہ بڈھے انگریز سے جو مالک تھا چائے پی۔ سترہ کے قریب کتابیں نکالیں۔ وہ کھانستے رہے اوپر سے۔ نیچے اترتے تو دستانے تک ٹھنڈے ہو جاتے۔ سرسوں کی طرح زرد ہو جاتے تھے۔ اس بڈھے نے چائے دی۔ اور میں نے اپنا گرم کوٹ بھی ڈال دیا۔ وہ سردی سے کانپتے رہے بڑے میاں اوپر سے جا کر ہیٹر بھی لے آئے میری وجہ سے۔ اور کچھ کتابیں بھی اتار کر لائے۔ اس نے بتایا کہ اس کی بھی اوپن ہارٹ سرجری ہو چکی ہے۔ پچاس پینی کی کتاب کو وہ فوراً پانچ پونڈ کر دیتا۔ جیسے ہی سرخوش کا ہاتھ لگتا۔ وہ اس سے اتنا ہی منت سے کہہ سکتے نو نو میک اٹ ٹو ففٹی۔ اور وہ نہیں دیتا۔ پانچ سے کبھی کم نہ کرتا۔ یو آر ویری کلیور بوئے۔ اور وہ قیمتیں بڑھاتا جاتا۔ میں اگر کم کراتی بھائی شیلی خفا ہو جاتے۔ کرنے دو میں اتنی محنت سے لایا ہوں اتار کے۔ یہ سب ممتاز صاحب کو چاہئیں۔ اور ممتاز صاحب چائے پیتے جاتے۔ کتابیں دیکھ کر نہال بوری بازار کے کمرے میں مونگ پھلیاں کھاتے جاتے۔ اور لہک لہک کر کہتے۔

"آغا جی! تھواڈا جواب نئیں۔ کی چیز لے آئے او۔ کڈ کے انگریزوی کی یاد کرن گے"۔ اور اب ان سے کتابوں سے قومی کتب خانے جگمگا رہے ہیں۔ اب نہ ممتاز حسن صاحب ہیں سرخوش نہ سر رضا علی۔ نہ راجا محمود آباد۔ نہ مجید صاحب۔ لندن میں وہ ہمیشہ ہی مجید صاحب کے پاس ٹھہرتے۔ یہ سب صاحبان سرخوش بھائی کو ایسے چاہتے تھے جیسے وہ ان کی اولاد ہوں۔ اب ساری کراچی میں کوئی شخص کتابوں کا ایسا مرکز تو پیدا کر کے دکھائے۔ کتاب محل جیسا معیاری۔ سلیقہ سے ایک ہی کتاب کسی اور دکان پر مل تو جائے۔ سرخوش بھائی کی نظر ہی تو تھی جو دماغی جلا سے مالا مال تھی۔ لندن ایمبیسی میں سلہا سال سے عاشق بٹالوی صاحب کو اس کام پہ رکھا تھا۔ بھٹو صاحب نے۔ وہ ایک دو مہینے بعد چھوٹی سی ایک فلم ڈبیا میں دے جاتے تھے۔ پاکستان بھیج دو اس کے عوض وہ کافی دن لندن میں رہے ہیں اور گورنمنٹ ان کا خرچ برداشت کرتی رہی تھی۔ اپنی اپنی نظر اپنا اپنا نصیب۔

۱۹۵۳ء میں سرخوش بھائی کی اوپن ہارٹ سرجری گائز ہسپتال لندن میں ہوئی تھی۔ وہ چیک اپ کے لئے ہمیشہ پانی کے جہاز سے جاتے تھے۔ سر رسل برگ جو سرجن تھا وہ سرخوش کو باہر تک

چھوڑنے آتا۔ جو انہیں "آغا کی ڈیول" کہا کرتا تھا۔ خوشی سے سرشار آجاتا۔ انہیں دیکھ کر۔ اس زمانے میں والوڈیزالو ہونے والے ملتے تھے۔ اتنی پروگریس نہیں ہوتی تھی بیس سال پہلے۔ اور رفتہ رفتہ بیس سال بعد وہ رگ پھر بھر گئی اچھے مرغن کھانے کے شوقین کا یہ حشر ہوا۔ چیک اپ کے بعد ہی وہ لندن کے قریبی قصبوں میں ضرور جاتے۔ ان کو یہاں کے چپے چپے کی پرانی کتابوں کی دکانیں معلوم تھیں اور کتابیں ڈھونڈتے رہے۔ جب تک خود پوسٹ نہیں کردیتے کتابیں چین نہیں آتا۔ کبھی پورٹ ساؤتھ گئے ہیں کبھی کنٹری سائیڈ کسی کو نہیں معلوم کہ ایک بیمار آدمی نے اپنے بچوں کے لئے رزق پیدا کیا۔ اپنے دل کی دماغ کی لگن کے لئے زحمتیں اٹھائیں ادب کی بھوک بھی بڑی بری بیماری ہے۔ اگر آپ کے خون میں ورثے سے ملی ہو تو اور بھی۔ دن رات بے چین کردیتی ہے۔ صبح چار بجے اٹھ کر قرآن شریف کے ابا کے مسودے دیکھا کرتے۔ آٹھواں پارہ چھپنے والا تھا چار پانچ ہزار کے قریب مشفق خواجہ صاحب کو بھیج دیئے تھے کہ وہ چھپوادیں گے۔ وہ سب جانتے تھے کہ وقت بہت کم ہے خود کہتے تھے کچھ اور دن میں جی لیتا تو قرآن شریف۔ ابا کے ناول ان کے دیوان چھپوادیتا۔ کچھ تو کرجاتا۔

لندن میں آخری دفعہ صبح بیٹھے باتیں کر رہے تھے مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کو اتنی جلدی جانا ہے تانا اکیلے تو بارہ دفعہ خون لیا۔ سوئی لگی رہی۔ خون نہیں آیا۔ میں تکلیف میں تھا۔ ایسی شدید تکلیف سے مرنا ہے تو گھر چلا جاتا ہوں۔ تم آج سیٹ بک ہی کرادو۔ اکیلے پھر سے اتنا سفر نہیں کر سکتا۔ مجھے اب اکیلے ڈر لگتا ہے ایسے ہی کہیں گر جاؤں گا۔ تو پھر رونے لگے۔ پائپ کی چنگاریوں میں افسوس پچھتاوے کیا کیا چھپالائے تھے۔ گھبرا کر بغیر پئے ہی کانپتے ہاتھ پائپ خالی کر گئے۔ اور میرا جی چاہا۔ کہاں سے بے چینی نوچ کے پھینک دوں سکون و صحت کے پیالے ان کو بھر کے پلادوں۔ مگر وہ تو پورے ہندوؤں کی رسم و رواج میں ڈوبے رہتے۔ بولے میں تمہارے گھر بھی نہیں رہ سکتا۔ بہن کے گھر نہیں رہتے سوپ' سلاد' ڈبل روٹی تک آپ اپنے پیسوں کی لاتے ہیں مجال ہے جو میرا کوئی کھانا چکھ بھی لیں میں خاموش ہو جاتی۔

کراچی میں روز عاشور بارش ہو رہی تھی۔۔ دوکان کا چوکیدار آیا آغا صاحب آپ کی دوکان پر سیٹھ نے ملبا ڈلوایا بجری سیمنٹ وغیرہ۔ سرخوش بھائی بھاگے گئے۔ دکان میں پانی بھر گیا تھا۔ اتفاق سے ایک رات پہلے جمیل الدین عالی بھائی کے گھر پر مشاعرہ تھا میں وہاں کمشنر کراچی عثمانی صاحب سے ملی تھی۔ چپ چاپ میں نے رکشہ لیا اور ان کے آفس بارش میں بھیگتی پہنچ گئی راستے

بھر سوچتی رہی ایسے اداس چپ چاپ سڑک پر پریشان کھڑے بے سہارا سے ٹوٹے سے لگے مجھے۔ سرخوش بھائی۔ اگر اس روز عثمانی صاحب مہربانی نہ کرتے تو میں سچ مچ جہاز لے کر صدر کے پاس اسلام آباد ضرور جاتی۔ ایسا غصہ ایسا دکھ تھا ہی کہہ سکی۔ عثمانی صاحب ایک گز زمین بھی الاٹ نہیں کرائی اپنے گھروں۔ دکان۔ دفتر۔ میں تالے لگا کر آگئے تھے۔ اپنی خوشی سے کہ پاکستان میں رہیں گے۔ کوئی کسی پر احسان نہیں تھا ۳۵ ہزار پگڑی دیکر اپنی محنت سے ایمانداری سے دکان چلاتے رہے۔ چپکے سے کیپٹل سینما خرید کر پانچ چھ دکان والوں کو تو "گل مچھیرا صاحب" سب کو دکانیں دے دیں گے۔ مگر کتاب والے کو کچھ نہیں دیں گے۔ کیونکہ اس نے بڑا شر مچایا۔ یہ مہاجر کتاب والا جو ہے مشہور زمانہ عابد سیٹھ سے مقابلہ تھا۔ نہ ان کے جیتے گل مچھیرے صاحب نے دکان کی چھت پر ملبہ ڈلوا دیا اور پھر سوراخ بھی کر دیئے بڑے بڑے کہ پانی سے کتابیں خراب ہو جائیں گی تو لامحالہ دکان جلدی خالی ہو گی۔ فیصلہ ہوئے بغیر عثمانی صاحب نے اسی وقت پولیس بھیجی کہ پانی رکوا دیا جائے۔ سوراخ بند کر دیئے جائیں۔ پھر تو میرے پیر گھس گئے نظامی صاحب سے ملنا بھی آسان نہ تھا۔ آخر کار انہوں نے بھی مہربانی کی۔ اور لکھ دیا گیا کہ جب تک دونوں فریق طے نہ کرلیں جگہ نہیں توڑی جائے گی۔ کے ڈی اے کے پھیرے کرتے کرتے پیر گھس گئے۔ ایک دن کچھ لکھوا کر آؤ۔ دوسرے دن صاحب معاملہ افسر چھٹی پر چلے جاتے۔ کیونکہ وہ سیٹھ صاحب سے وعدہ کر چکے ہوتے ان کے پیسے ان کی جیب میں پڑے ہوتے اب چاہے احمد ندیم قاسمی کالم لکھیں چاہے محمد علی صاحب چاہے رئیس امروہوی صاحب اس ادبی نوک جھونک طنز سے کیا بنتا۔ اب ڈھونڈتے پھریئے ادبی کتابوں کی کوئی دکان جو سلیقے کی کتاب مل جائے۔ کتاب محل سے۔ سرخوش بھائی کی نظر ہی تو تھی جو دماغی جلا سے مالا مال تھی ایسی نایاب ادبی کتابیں ڈھونڈتے۔ نیول کشور کی چھپی ہوئی کتابیں۔ پھر قیمت بھی وہ صرف کتابوں کی لگاتے تھے۔ دوکان پر کام کرنے والوں کی تنخواہوں کا حصہ بالکل نہیں کاٹتے تھے۔

تیس پینتیس ہزار پگڑی کی دوکان۔ چالیس سال بعد وہ دوکان (کتاب محل) صرف ۳ لاکھ دے سکی۔ گل مچھیرے صاحب نے دوسری چار دوکانوں والوں کو پندرہ سولہ لاکھ دلوا دیا۔ صرف کتابوں کی دوکان کو تلئیر ہونے کے سبب سے۔ جن کتابوں کی دوکان کے بارے میں احمد ندیم قاسمی نے بڑا سا کالم لکھا ہے کراچی میں رئیس امروہوی نے لمبا چوڑا کالم لکھا ہے۔ نورانی اور ہر صاحب ذوق کتابوں کے دلدادہ کالم نویسوں نے شہر کے باخبر لوگوں کی نظروں کو متوجہ کیا کہ یہ

کتاب محل آخری سانس لے رہی ہے مگر اس کے مالک کو جو خود گور کے قریب ہے کچھ زیادہ پیسے مل جائیں چالیس سال بعد صرف ۳ لاکھ ملے۔ مشہور زمانہ سیٹھ صاحب کے پاس ایک شیعہ مولوی صاحب کے توسط سے گئے مگر وہ صرف مچھیرے صاحب سے عابد سیٹھ ٹیلی فون پر یہی پوچھ سکے بول گلو۔ کتاب والا بیٹھا ہے بول کتنے دے گا۔ ادھر سے جواب آیا۔ اس کتاب والا نے اخبار میں بہت ہلا مچایا۔ اس سے کچھ نہیں ہوا نہ ہو گا۔ بولو اگر تین لاکھ لیتا ہے تو لے لو ورنہ چھٹی کرو۔ یہ سب سرخوش بھائی نے مجھے دکھ سے لندن میں بتایا تھا سارے پرانے چہرے غائب ہو گئے۔ سندھ امپورٹ فیشن ہاؤس والے چپکے چپکے ۱۶ لاکھ ۱۵ لاکھ لے کر کھسک گئے۔ آغا صاحب کو کون پوچھتا ہے رشتے دوستیاں پیسے کی آڑ میں کھو گئیں۔ ۳ لاکھ نے ماں اور بیٹے کی زبان بھی بند کر دی گویا وہ اس انتظار میں تھے دونوں کا سفر ایک تھا صرف ۳ لاکھ ملتا اور اپنے بچوں بیوی کے فرض کی ادائیگی کے لئے بیٹھے تھے۔ دونوں ماں بیٹوں نے بڑا کٹھن وقت تنہائی دکھ میں گذار لیا صرف قبروں کی زمین میں دونون چپ چاپ چلے گئے۔

کون کہتا ہے کہ میں مہاجر ہوں وہ مہاجر تھے اپنے بند مکان میں تالے لگا کر آئے تھے خوشی خوشی۔ میں نے جہاز سے اتر کر اس پاکستان کی زمین چومی تھی میں مہاجر نہیں ہوں۔ اپنے گھر دیئے ان کے گھر لئے۔ گھر بدلنے کا کھیل چالیس پچاس سال سے کھیل رہے ہیں۔ میری ماں، بھائی کو اپنا گھر مل گیا۔ اور میں اپنے گھر کے انتظار میں ہوں۔ جس کے لئے صرف دو گز کی زمین چاہئے۔ اس پاکستان کی زمین۔ جو نہ سندھ کی ہے نہ پنجاب کی۔ میں اس پاکستان کی زمین پر خوشی سے آئی ہوں۔۔ میں نے بھی چیخ چیخ کے نعرے لگائے تھے۔ "لے کے رہیں گے پاکستان" بات تو بے وفا زمین کی ہے۔

معیاری ادبی کتابیں
پانچ جدید شاعر
جملۂ معترضہ